Part -1

برفیلی بلندیاں

مستنصر حسین تارڑ



’’فیری میڈو اور نلتر پکھورا ٹریک‘‘



پہلا سفر

''ہوشے سے درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ تک اور لیلیٰ پیک''

دوسرا سفر



پہیلا سفر

"مُرغانِ چمن کا سرسری تعارف اور کچھ نئے پرندے"

یہ سفر اس لائق تو نہیں کہ اسے لکھا جائے...

دراصل کے ٹو کہانی ، نانگا پربت ، یاک سرائے اور سنولیک کے بعد کوئی بھی سفر.. پہاڑوں کا سفر اس لائق نہیں لگتا کہ اُسے لکھا جائے..

لیکن اس سفر کے کچھ کردار ایسے ہیں جنہیں لکھا جانا چاہیے..

یہ کردار ایسے ہیں کہ اگر انہیں میں نے نہ لکھا تو یہ بدروحیں بن کر میرے خوابوں میں آئیں گے۔ رات کو غسل خانے کی بتی جلانے سے پہلے وہاں موجود ہوں گے اور "ہم آ گئے ہم آ گئے" کے قہقہے لگاتے میری روح فنا کر دیں گے.. پریشان کریں گے.. مجھے ڈرائیں گے..

تو میں ان کرداروں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ یہ میرے خوابوں میں آئیں ..رات کو میرے غسل خانے میں اُدھم مچائیں اور میری زندگی اجیرن کر دیں۔

صرف اس لیے میں اس سفر کو بھی لکھنا چاہتا ہوں..اگرچہ یہ اس لائق نہیں کہ اسے لکھا جائے..

چونکہ اس سفری داستان میں چمن اتنا اہم نہیں جتنے کہ اس میں چہکنے والے پنچھی ، پرند اور پکھیرو... اس لیے مناسب رہے گا اگر ان طیور.. ان مرغانِ چمن کا سرسری تعارف کروا دیا جائے.. جیسا کہ ڈرامہ نگار سکرپٹ کے آغاز میں مرکزی کرداروں کی خصلتیں اور عادتیں مختصراً بیان کر دیتا ہے تا کہ پروڈیوسر کو کاسٹنگ میں آسانی ہو کہ کونسا اداکار کس رول کے لیے موزوں رہے گا..

ان میں کچھ قدیمی پنچھی ہیں جو متعدد کوہ نوردیوں میں میرا ساتھ دے چکے ہیں اور

میرے پڑھنے والے اُن سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں..اور کچھ پرندے نئے نویلے ہیں جو پہلی بار چمن میں چہکے ہیں۔

پرانے اور کھانگڑ پنچھیوں میں میاں فرزند علی ہیں جو پرندے کو پرندہ اور گھڑے کو گھرا کہتے ہیں۔اندرون بھاٹی گیٹ کے قدیمی مکین ہیں اس لیے انہیں باہر کی ہوا نہیں لگی۔چنانچہ ان کی لاہوری وضع داری اور یاروں پر قربان ہونے کی خصلت نہیں بدلی..اسی لیے دنیاداری کے ناپ تول کے ماہر نہیں۔ناچے پتھروں اور ناچنے والیوں کو پرکھنا جانتے ہیں..انھی کے بارے میں اولڈ از گولڈ کا محاورہ گھرا گیا تھا..معاف کیجیے گا گھڑا گیا تھا..

دونمبر کھیپیرو شاہد صاحب ہیں جو ناپ تول کے شدید ماہر ہیں۔ہمیشہ ہمیں چکرانے کے چکر میں رہتے ہیں لیکن ہم جیسے کائیاں گاہکوں کو چل نہیں دے سکتے..ہم لیڈر رہوں نہ رہوں اُن کی ڈپٹی لیڈری پکی ہے اور یہ اعزاز انہوں نے بقلم خود اپنے آپ کو عطا کر رکھا ہے..پورٹروں اور ہوٹل والوں سے مذاکرات کے ماہر ہیں اور اتنے تواتر سے اور دھیمے دھیمے بولتے چلے جاتے ہیں کہ پورٹروں اور ہوٹل والوں کو نیند آنے لگتی ہے اور وہ ایک اونگھ میں ہماری شرائط مان جاتے ہیں..اکثر جہاں مجھے بات کرنی ہوتی ہے، وہ مجھے دھکیل کر آگے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "میں ڈپٹی لیڈر ہوں مجھ سے بات کریں، لیڈر کا مقام تو بہت بلند ہے اور بلندی پر زیادہ دیر قیام کرنے کے باعث انہیں زکام ہے، گلا بیٹھا ہوا ہے بات نہیں کر سکتے..یوں بھی عمر رسیدہ ہیں اور تھوڑے سے بوکھلائے ہوئے ہیں.." مہم کے اخراجات کا حساب کتاب ہمیشہ اُن کے ذمے ہوتا ہے اور وہ یہ حساب کرتے ہوئے ہمہ وقت اپنے جاسوس ہیٹ پر ہاتھ پھیرتے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نیچے جو سر ہے اُس پر شاید اب کچھ بال اُگ آئے ہوں..سیاہ چشمہ اُتارتے چڑھاتے اخراجات کی نوٹ بک پر تادیر غور کرتے ہیں اور اکثر کسی نہ کسی ممبر کو یہ کہہ کر ناراض کر لیتے ہیں کہ چوہدری صاحب آپ نے فلاں کھانے کے دوران ایک کی بجائے دو بوتلیں پی تھیں، براہِ مہربانی فالتو بوتل کے پیسے فوراً ادا کر دیجیے..بجٹ خراب ہو رہا ہے..

پھر ایک نازک اندام حسن والے محض حسن صاحب ہیں..اپنی بیوی کے تذکرے پر فوراً کھل جاتے ہیں جب کہ ہم لوگ فوراً مرجھا جاتے ہیں..ایک بار کرنل محمد خان نے میری حوصلہ افزائی کی خاطر..جیسے ایک بچے کی حوصلہ افزائی کی خاطر اُسے کہہ دیا جائے کہ جب تو بڑا ہوگا تو یقیناً راج ہنس بن جائے گا ایسے کرنل ڈیئر نے لکھا کہ وہ شہر، وہ گاؤں کس کام کے جہاں کم از کم ایک

مستنصر حسین تارڑ نہ ہو..ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد..تو میں حسن صاحب کی حوصلہ افزائی کی خاطر نہیں بلکہ تہہ دل سے اُن کی طبیعت کی سادگی اور ریشمی خصلت سے متاثر ہو کر یہ کہوں گا کہ وہ کوہ نوردیاں، وہ سفر کس کام کے جن میں کم از کم ایک حسن ہمراہ نہ ہو...ویراں شود آں شہر کہ یک حسن ندارد..

اس سفر میں پرنس سلیم بھی ہمارے ساتھ تھا..یہ سچ مچ تو پرنس نہیں تھا محض نام کا فائدہ اٹھا رہا تھا..جیسے ہمارے کالج کی کینٹین کا ٹھیکیدار چنگیز محمود اپنے نام کی وجہ سے دنیا بھر کے منگولوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا..سلیم شکل سے ایسا ولن لگتا ہے جو ہیرو کی خلوتوں میں رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے..اگرچہ اُس نے میرے ساتھ جانے کا ارادہ تو کے ٹو کہانی کے زمانے میں باندھا تھا لیکن پھر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اُس نے یہ بندھا ہوا ارادہ کھول دیا..اور اب اتنے برسوں بعد جب اُس نے پھر سے یہ ارادہ باندھا تو ہم نے خصوصی بندوبست کیا اور اُسکے بندھے ہوئے ارادے کی گانٹھ کو وقت کے پانی سے سینچ کر ایسا پکا پیڈا کر دیا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کھول نہ سکے..یہ طریقہ پرانے زمانے میں دولہن کے ازار بند کی گانٹھ پر آزمایا جاتا تھا..پرنس سلیم نے نہایت بکھری ہوئی واہیات نوعیت کی مونچھیں پالی ہوئی ہیں اور جب مسکراتا ہے تو اپنے ناہموار دانتوں کے باعث بگز بنی کا بڑا معلوم پڑتا ہے..لیکن پرنس چارمنگ ایسا ہے کہ کسی بھی نور جہاں کو ملنے پر اُسے کبوتر نہیں تھماتا کہ ان کا خیال رکھنا بلکہ اپنا فون نمبر تھما دیتا ہے کہ کر لینا..لاہوریوں کی خاص حسِ مزاح کا حامل ہے اور اس کے اکثر لطیفے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر حاملہ ہونے کا گمان ہوتا ہے..

آپ چہار تحفہ ملتان یعنی..گرد، گرما، گدا اور گورستان سے تو واقف ہوں گے..پہلے تو صرف گدا ہوا کرتا تھا جو ہمارا قدیمی ساتھی تھا، لیکن اس بار اس کے ساتھ گرد بھی چلا آیا..اسے ہم گرد آمیز بھی کہہ سکتے ہیں..گرد آمیز کا تعلق ملتان کی ایک قدیم اور بااثر گرد آمیز فیملی سے ہے..باتوں میں ملتان کے رسیلے آموں جیسی مٹھاس رکھتا ہے۔آپ اس مٹھاس سے اتنے جڑ جاتے ہیں حرکت بھی نہیں کر سکتے۔قہقہہ بے مثال لگاتے ہیں اور یقیناً جب وہ اپنے آم کے باغوں میں یہ حرکت کرتا ہوگا تو درختوں پر بیٹھے معصوم طوطے لڑھک کر گر جاتے ہوں گے..شاید ان میں سے ایک آدھ جاں بحق بھی ہو جاتا ہو..فوٹوگرافی میں یدطولیٰ رکھتا ہے۔گھر کے اندر ایک سٹوڈیو بنا رکھا ہے جس میں کل جہان سے درآمد کردہ آلات تصویر کشی، پس منظر کے منقش پردہ جات، روشنی جات، اور چھتریاں وغیرہ پائے جاتے ہیں..بیش قیمت کیمرہ جات کا مالک ہے اور ان کے ساتھ وہی

سلوک کرتا ہے جو مالک غلاموں کے ساتھ کرتے ہیں.. جب اپنے تھیلے میں سے کیمرہ برآمد کر کے اس کے آگے ایک لمبا سا زوم لینز فٹ کرتا ہے تو کیمرہ فی الفور نخش ہو جاتا ہے بلکہ ایک چھوٹے موٹے ایٹمی ہتھیار کا روپ اختیار کر لیتا ہے..ایک ملتان یاترا کے دوران گدا نے اس سے ملاقات کروائی اور اس نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک پُرتکلف کھانا کھلا کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ سائیں ہمیں ساتھ لے چلو.. گو صحت سے اور شکل سے ناز و نعم میں پلا ہوا..کچھ زیادہ پلا ہوا ایسا بچہ لگتا تھا جس نے عمر بھر گھر سے باہر قدم نہ رکھا ہو..چنانچہ میں نے پوچھا کہ سائیں کیوں ساتھ لے چلوں تو بولا..سائیں ہم فیری میڈو کو شوٹ کریں گے..اور واقعی انہوں نے فیری میڈو کو ایسا شوٹ کیا کہ وہ ابھی تک اپنے زخم چاٹتا ہے..

ان پانچ تحائف کے سوا تین ایسے تحفے بھی ہمارے ہمراہ تھے کہ ہم بے شک اس رب کا شکر ادا کر سکتے تھے جس نے ہماری گائے بنائی تھی' لیکن انہیں بنانے پر ہم اس کا شکر ادا کرنے میں قدرے جھجکتے تھے..کہ یہ بنائے ہیں؟..

تحفہ نمبر ایک..عمران بابر..تقریباً دو برس پیشتر کسی حوالے سے میری سٹڈی میں وارد ہوا..نیکر پہنے اور اُسے ہمہ وقت ٹٹولتا ہوا کہ اس کے نیچے کچھ ہے بھی یا کہ نہیں..عینک پہنے اور داڑھی پہنے جسے وہ ہمہ وقت شاید جوؤں کے تعاقب میں کھجلاتا جا رہا تھا..میری سٹڈی میں آیا'' سر جی میں کالج کے زمانے سے آپ کے سفرنامے پڑھتا آیا ہوں..برباد ہو چکا ہوں..ذرا یہ دیکھئے..اُس نے میرے متعدد شمالی سفرنامے تاش کے پتوں کی طرح میرے سامنے پھینک دیئے..ہر کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر نوٹس تھے، سرخ پنسل کے نشان تھے۔ یہ میری آپ سے کمٹمنٹ کے ثبوت ہیں کہ ایک دن میں ان سفرناموں پر مبنی ڈاکومنٹریاں بناؤں گا..میں دس برس سے تیاری کر رہا ہوں..آپ اس بار مجھے بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیں..یقین کیجیے اس میں اتنا مالی فائدہ ہوگا کہ آپ یہ ادب وغیرہ بھول جائیں گے اور اس مختصر سے گھر سے نجات حاصل کر کے کم از کم چار پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس بنا کر اس میں منتقل ہو جائیں گے..یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تب آپ کے پاس ایک لینڈ کروزر بھی ہوگی اور گیٹ کے باہر..جس گیٹ کو ابھی ابھی آپ نے اپنا ازار بند اُڑستے ہوئے کھولا تھا وہ نہیں بلکہ فارم ہاؤس کے گیٹ کے باہر مسلح گارڈز بھی ہوں گے..''

میری تو باچھیں کھل گئیں، میری ناآسودہ اور ناممکن خواہشوں کی تکمیل کرنے والا شخص آج میرے سامنے موجود تھا..میں کب سے ادب اور ٹیلی ویژن کو تیاگ کر ایک پانچ ایکڑ کے فارم

ہاؤس میں مسلح گارڈز کی رفاقت میں زندگی بسر کرنا چاہتا تھا..اور یہ فرشتہ مجھے یہ سب کچھ آفر کر رہا تھا..اگرچہ میں فوری طور پر'' قبول ہے،قبول ہے'' کے نعرے لگانا چاہتا تھا' لیکن پھر میں نے اپنے امیج اور ادبی شہرت کو فوری طور پر داغدار کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے نہایت لاپروائی سے کہا'' مسٹر عمران بابر..میں آپ کی آفر پر غور کر سکتا ہوں..بہر حال میں یہ تو جانتا ہوں کہ میں شمال کا ایک سیلف سٹائلڈ ایکسپرٹ ہوں' لیکن میں آپ کو آپ کی صلاحیتوں کو نہیں جانتا چنانچہ کچھ ثابت کیجیے..''

عمران اپنی نیکر کو ٹٹولتا چلا گیا..اگلے روز وہ مجھے ایک ایسی وڈیو کیسٹ دے گیا جس میں اس کے کچھ'' پروجیکٹ'' تھے..ٹیلی ویژن پر چلنے والے اشتہار، میوزک وڈیوز، فلمیں، ایک ڈاکومنٹری..جو اس کی کیمرہ کرافٹ اور ہدایت کاری سے وجود میں آئے تھے، میں نے اس کیسٹ کو ملاحظہ کیا تو ان کی تصویر کشی اور روایت سے مکمل سرکشی کی تخلیقی صلاحیت سے اتنا متاثر..اور پھر فوری طور پر شرمندہ ہوا کہ میں نے ایسے باکمال اور اوریجنل شخص کا امتحان لیا..اس کی صلاحیتوں پر شک کیا..چنانچہ جب وہ..یعنی عمران بابر دو تین روز بعد ایک کھسیائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اور نیکر ٹٹولتے..داڑھی کھجلاتے میرے پاس آیا تو اب میں اُس کا مداح ہو چکا تھا اور اس سے درخواست کر رہا تھا کہ عمران پلیز میرے ساتھ چلو..میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ پاکستانی شمال میں جو جادو ہے وہ پوری دنیا کے سر چڑھ کر بولے..اس میں جو طلسم ہے وہ کیمرے کی آنکھ قید کرے..اور ایسے کرے جیسے میں اسے دیکھتا ہوں..نہ یہ ٹورسٹ یا ٹورسٹ آپریٹر یا ٹورازم کا محکمہ نہیں کہ یہ ان کے لیے کاروبار ہے۔ ملازمتیں ہیں..جیسے میں اس حیرت کدے کو دیکھتا ہوں ویسے کیمرہ دیکھے اور دنیا کو دکھائے..اور تم ہی وہ شخص ہو اگرچہ نیکر پہنتے ہو۔ جو یہ کام کر سکتا ہے..

چنانچہ عمران نے مجھے مائل پا کر بقول اُس کے ایک زر کثیر خرچ کر صرف اس مہم کی خاطر ہانگ کانگ اور امریکہ سے خصوصی آلات تصویر کشی امپورٹ کئے..ایسے مائیک اور لائٹیں درآمد کیں جو بلند پہاڑوں میں کارآمد ہو سکتے تھے اور یوں میرا ساتھی بن گیا..میں اس کی داڑھی اور نیکر میں پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس اور چند مسلح گارڈز دیکھتا تھا..

جیسے شمر تنہا نہ تھا ایسے عمران بھی تنہا نہ تھا..اس کے ہمراہ دو بغل بچے تھے جو اپنی قدامت کے باعث اس کی بغل میں نہ آ سکتے تھے اور پھر بھی بغل بچے تھے۔ یہ دونوں بچے اسے گورو مانتے تھے اس کی اطاعت کرتے تھے..مرشد جانتے تھے اور ہر لمحہ اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔

ان میں ایک تو کاظمی تھا..

کاظمی ایک فل ٹائم ہنستا ہوا بغل بچہ تھا جو ٹیلی ویژن کے لیے میوزک ہنگامہ یا یہ تو ہے لونی ڈ قسم کے پروگرام پروڈیوس کرتا تھا اور خود بھی تھوڑا سا لونی ہو چکا تھا..لازمی شکل سے میکسیکو کے کسی ڈرگ بیرن کا کارندہ لگتا تھا لیکن نہایت ہونہار بغل بچہ تھا..

ان میں دوسرا طاہر تھا..

اور یہ بہت ہی طاہر تھا کیونکہ زمین سے نکل کر ظاہر ہوتا ہی چلا جاتا تھا..باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی کی مانند طویل قامت..کانوں میں بالیاں..مکمل طور پر اُسترا شدہ سر..یعنی ایک دھڑ کونا نما ٹنڈ..جو اتنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا تھا کہ دو چار ڈگوں میں ہی فیری میڈو جا پہنچا تھا۔اتنا کم گو کہ سفر کے پہلے دو تین روز ہر خاص و عام نے اسے گونگا جانا اور اشاروں میں باتیں کیں..اور اس کے قد و قامت اور جثے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے اسے ایک گونگے جن کے خطاب سے نوازا تا آنکہ ایک روز اس نے اپنی کم گوئی اور خاموشی کا قفل کھول کر اطلاع کی کہ جناب میں جن نہیں ہوں،لیکن پھر بھی آپ کے حکم کا تابع ہوں..آپ سب مجھے اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو اپنا پرائیویٹ جن سمجھ لیجیے۔

اور ہم نے سمجھ لیا..

چنانچہ ایک عجیب لایعنی اور محیر العقول ٹیم تشکیل پا گئی..یعنی میاں فرزند علی..شاہد،حسن، پرنس سلیم،گدا اور گرد آمیز..عمران،کاظمی اور طاہر اور ہم سب کے سب شمال کو جاتے تھے..اور ہاں، میں بھی!

''سنہری چوغہ،ننگی تلوار اور قراقرم کی رات میں رقص''

''ماموں ذرا ناچیں..''

ماموں بھالو کی طرح ناچنے لگے..

دیوسائی کے ایک بھالو کی طرح ناچنے لگے..

ہم ایک مرتبہ پھر گلگت سے باہر ایک رات میں تھے..

ہنزہ روڈ پر بلند ایک پہاڑی ڈھلوان پر ایک سرد ہوتے شالیمار میں تھے۔فضل کے ماموں نے ایک مرتبہ پھر مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو اپنے پہاڑی گھر میں مدعو کیا تھا اور تختہ بہ تختہ سڑک تک جاتے اپنے شالیمار باغ میں ایک شاہانہ شمالی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا..

ہم قالینوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے..تازہ سلاد چباتے طرح طرح کے مقامی مشروب نوش کرتے..نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے..تالیاں بجاتے ماموں کو داد دے رہے تھے..

لیکن ماموں کا رقص واحد آئٹم نہ تھا..اس سے پیشتر اکرام بیگ ننگی تلوار لہراتا ایک سنہری چوغے میں گھومتا ہمیں اپنے باکمال رقص سے حیران کر چکا تھا۔حیرانی کے ساتھ تشویش بھی تھی کہ وہ تلوار اس تیزی سے گھماتا ہمارے سروں پر لہراتا تھا کہ ہم فوراً زیر لب کلمہ پڑھ لیتے تھے کہ اب وقتِ شہادت ہے آیا..اور ابھی یہ سر تن سے جدا ہو جائے گا..لیکن پھرتیلا چھریرے بدن کا بیگ ایسا کاریگر تھا کہ تلوار ہمارے بالوں کو چھوتی گزر جاتی اور واقعی ہمارا ایک بال بھی بیکا نہ ہوتا تھا..

جب صلائے عام کا دور شروع ہوا تو مجھے اعزاز بخشنے کے لیے ایک سینکڑوں برس قدیم

تلّے دار چوغہ پہنایا گیا (اور بعد میں اہتمام سے اُتروا لیا گیا کہ کہیں میں اُسے گھر نہ لے جاؤں)..
پھر میرے ہاتھوں میں تلوار تھما دی گئی۔ تلوار خاصی وزنی تھی اور میری کلائی اگر مخنث ہوتی تو اس میں ضرور موچ آ جاتی.... مجھے بھی رقص کرنے کے لیے کہا گیا.. اگرچہ بچپن کی غلط کاریوں میں ایک غلط کاری یہ بھی تھی کہ میں نے انگلستان میں وکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ سے بال روم ڈانسنگ کی ایک مختصر تربیت حاصل کی تھی جس کے نتیجے میں مجھے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا تھا جو اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ حامل ہذا والز، فوکس ٹراٹ، کوئیک سٹیپ اور ٹینگو وغیرہ بخوبی ناچ سکتا ہے اور اس نے ہماری لیڈی انسٹرکٹر کے پاؤں تربیت کے دوران اتنی مرتبہ کچلے ہیں کہ وہ بے چاری اپاہج ہو چکی ہے.. لیکن یہ تو گئے زمانوں کے قصے تھے، اب عناصر میں اعتدال کہاں تھا.. یوں بھی ایک گوری گوری او بالی چھوری کو بازوؤں میں تھام کر اس کی گرمی اور گداز کو محسوس کرتے والز کے سٹیپ لینا اور بات تھی اور ایک سنہری چوغہ زیب تن کر کے تلوار گھماتے رقص کرنا ایک جہانِ دیگر تھا.. چنانچہ میں ایک عمر رسیدہ ڈان کے خوتے کی مانند اس ورزش کے دوران قدرے ہانپ گیا بلکہ اب میرے ساتھی تشویش میں تھے کہ تلوار گھماتے ہوئے میں ذرا بے اختیار ہوتا تھا اور اس بے اختیاری کے دوران میرے ساتھیوں کے سر اڑ سکتے تھے.. اور میں تاریخ عالم میں ایک ایسے ادیب اور کوہ نورد کے طور پر جگہ نہ پانا چاہتا تھا جس نے گلگت میں ایک شب عالمِ بے خودی میں اپنے تمام ساتھیوں کے سرتن سے جدا کر دیئے تھے..

چند ایک گھمن گھیریاں کھا کر چکرا کر ہانپتے ہوئے تلوار بمشکل سنبھالتے جب میں نے مزید ورزش سے معذرت کی کہ خوش رہو اہلِ چمن ہم تو سفر کرتے ہیں تو تب فضل نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا.. یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ وہ میرے رقص کے بعد ابھی تک قائم ہے یا نہیں بلکہ اپنے اٹکتے رکتے لہجے میں ماموں جان سے درخواست کرتے اُس نے سر پہ ہاتھ پھیرا.. کہ ماموں ذرا ناچیں..

اور ماموں جو بقول ان کے ہنزہ کے نمبرون ڈانسر ہیں.. ناچنے لگے..

عمران اور اس کے دونوں مرید کیل کانٹوں سے لیس.. یعنی کیمرے سنبھالے، لائٹیں، کیبلز اور مائک اور وی سی آر سنبھالے خورد و نوش کے وسیع انتظامات سے قطعی بے پرواہ صرف اپنے کام سے کام رکھتے قراقرم کے دامن میں ایک اوپن ایئر پارٹی کو شوٹ کر رہے تھے..

میں نے جب ہتھیار ڈالے یعنی تلوار ڈالی تو سب سے زیادہ احتجاج عمران نے کیا "سر

یہ آپ کیا کر رہے ہیں.. تھوڑی دیر تو اور ناچیں.."

"اور اپنے ساتھیوں کے سر قلم کر دوں؟"

"ویسے سر.. ان میں ایک دو ساتھی تو ایسے ہیں جن کے سر قلم کرنا جائز ٹھہرتا ہے.. اگر کر دیتے تو میری موج ہو جاتی.. کیا ڈرامہ بنتا.."

"تم ایک کٹھور اور نہایت خود غرض انسان ہو.."

"میں اپنے کام کے لیے ہوں سر.. مجھے اپنے کام سے غرض ہے آپ سے نہیں.. لیکن یقین جانیے میں بنیادی طور پر ایک نہایت حساس شخص ہوں.. مجھے اس لمحے بھی اپنی بیوی یاد آ رہی ہے جو اس وقت جانے کون سے آسمانوں میں پرواز کر رہی ہوگی.. آپ جانتے ہیں ناں کہ وہ ایئر ہوسٹس ہے.."

"میں جانتا ہوں.. لیکن تم ماموں پر دھیان دو، وہ رقص کرتے کرتے نڈھال ہو رہے ہیں.. کیمرہ ان پر مرکوز کرو."

"ویسے سر جی.." عمران آج شب بھی نیکر میں تھا اسے ٹھنڈ لگتا تھا.. "ابھی تھوڑی دیر پہلے ماموں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ایک آبائی صندوق میں ایک نہایت نایاب سینکڑوں برس پرانی منقش تلوار اور ٹوپی ہے.. آپ ان سے کہیں کہ وہ ٹوپی اور تلوار ذرا نکال لائیں میں اُن کو شوٹ کرنا چاہتا ہوں.."

"کونسی تلوار.." اکرام بیگ کھیرے کھانے کا شوقین تھا اور ابھی تک تقریباً درجن بھر کھا چکا تھا "کونسی تلوار.."

"جو ماموں کے صندوق میں ہے.. سینکڑوں برس قدیم.. ان زمانوں کی جب اہلِ ہنزہ ڈکیت ہوا کرتے تھے اور چین جانے والے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے.. ان زمانوں کی نایاب تلوار.."

"کوئی تلوار نہیں ہے.." جب وہ سلاد کے طشت میں سے چُن چُن کر کھیرے کی پھانکیں کھا چکا تو ٹماٹروں کی جانب راغب ہو گیا۔

"ماموں کہتے ہیں بیگ صاحب.." عمران نے مسکرا کر کہا..

"کوئی تلوار نہیں.. نہ صندوق ہے.. نہ ٹوپی ہے.. نہ میں ہوں.. نہ آپ ہیں"

عمران نے براہِ راست ماموں سے رجوع کیا "سر پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے وہ

تلوار لے آئیں جو ظاہر ہے آپ کے آباؤ اجداد کی نشانی ہے اور جس پر ابھی تک چینی تاجروں کے خون کے نشان بھی ہوں گے. تھوڑی دیر کے لیے لے آئیں.. پلیز!''

''لائیں گے.. لیکن ابھی نہیں لائیں گے..'' ماموں نے رقص کرتے ہوئے ایک تحش ٹھمکا لگایا'' ہمارے بزرگوں کا کہنا تھا کہ اجنبی اس تلوار کو دیکھ لیں تو بڑا شگون ہوتا ہے.. وہ قتل ہو جاتے ہیں.. اب بھی آپ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں..''

''ہاں ماموں..''

''دکھا دیں گے.. دکھا دیں گے..''

''کیوں فضل..'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا'' تلوار ہے؟''

فضل کندھے ہلا کر.. اپنے رف ٹف چہرے سے مسکرا کر.. نہایت ڈپلومیٹک ہو کر کہنے لگا'' اگر ماموں کہتے ہیں تو ہے.. ماموں ہیں ناں..''

اور ماموں دیوسائی کے ایک بھالو کی طرح ناچ رہے تھے.. ایک رُکتی ہوئی ردھم میں.. تھم تھم کر.. رُک رُک کر.. سٹیریو کے سپیکر میں سے.. جو کہ اس باغ شالیمار کے چار کونوں میں آویزاں تھے.. ان سپیکرز میں سے برآمد ہونے والی ہنسری اور ڈھول کی آزردہ اور اداس تھاپ پر.. ماموں مست ملنگ ہو کر.. ناچتے تھے.. اور عمران اُن کے آگے پیچھے لیتا.. کبھی گھاس پر.. کبھی کسی خوبانی کے پیڑ کی اوٹ میں.. انہیں شوٹ کرتا تھا.. یہیں اس باغ ارم میں.. خوبانی کا ایک ایسا گھنا اور نادر پیڑ تھا.. ایک شاندار شجر تھا جس میں ابھی پچھلے برس شمشال بے مثال کے برس میں سینکڑوں زرد سورج چمکتے تھے..

میں اپنے قالین سے بمشکل اُٹھا.. جب کہ تلوار ہے کہ نہیں کا مکالمہ جاری تھا اور اُٹھ کر روشنیوں کی زد سے پرے جو تاریکی تھی وہاں چلا گیا.. کہ وہیں وہ گھنا شجر تھا.

اور وہاں پہنچا ہوں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا..

نہ وہ شجر تھا اور نہ اس پر طلوع ہوتے ہوئے خوبانیوں کے سینکڑوں سورج.. کچھ تاریک درخت تھے.. جو مجھے نہ جانتے تھے..

وہ سب کچھ کہاں چلا گیا؟

شاید ایسا ہے کہ وہ شاندار شجر محض ''شمشال بے مثال'' کے سفر کے دوران ہی اس ڈھلوان شالیمار کے کناروں پر نمودار ہوا تھا. صرف اُس ایک شب کے لیے.. ہر نئے سفر پر منظر بدل جاتا ہے..

بار بار دیکھا ہوا منظر.. ہر سفر پر بدل جاتا ہے.. وہ نہیں رہتا جو کہ وہ تھا.. آپ بھی وہ نہیں رہتے جو کہ تھے.. بدل جاتے ہیں..

جیسے دریا کے پانی وہ نہیں رہتے جو کسی ایک پل میں نظروں کے سامنے ہوتے ہیں.. وہ بدلتے رہتے ہیں.. بہاؤ میں رہتے ہیں.. نئے پانی اُترتے رہتے ہیں.. اس لیے جن پانیوں میں آپ قدم رکھتے ہیں وہ بہہ جاتے ہیں اور جب اس دریا میں چند لمحوں کے لیے آپ دوبارہ اپنا قدم رکھتے ہیں تو وہ دریا کوئی اور ہوتا ہے.. بدل چکا ہوتا ہے..

ایسے منظر بھی بدل جاتا ہے.

ہر سفر میں شجر بدل جاتے ہیں.. گھاس، پتھر، خودرو بوٹے اور پھول بدل جاتے ہیں.. نہ آپ ان کو پہچان سکتے ہیں اور نہ وہ آپ سے شناسائی رکھتے ہیں.. اس لیے اگر آج کی شب.. اس برس.. وہ آفتابوں سے بھرا خوبانی کا درخت مجھے دکھائی نہ دیتا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی..

ہر شے بہاؤ میں ہوتی ہے.. بدلتی رہتی ہے..

ایک عمر رسیدہ لیکن ابھی تک پھرتیلی اور چاق و چوبند بیلے رینا کی مانند ماموں تلوار گھماتے ناچتے تھے..

ہم لاہور سے کسی پرائیویٹ ویگن میں سوار اسلام آباد سے براہ راست گلگت تو نہیں آگئے تھے..

راستے میں رُکے تھے..

بشام میں شیر دریا کے سحر طراز کناروں پر قیام کیا تھا..

شاہد مرزا لاہوری کے شاندار کارپٹ میوزیم میں کچھ دیر کے لیے رُکے تھے جو بشام موٹل کے راستے میں آتا تھا.. اس کے قالینوں پر براجمان ہو کر اپنی تھکن اتاری تھی اور روسٹ چکن اور آلو کے خستہ قتلوں کا سنیک کیا تھا..

مرزا لاہوری ایک پھرتیلا لیکن نہایت سعادت مند لاہوری ہے جو کسی زمانے میں ٹورسٹ گائیڈ ہوا کرتا تھا اور پھر جاپانی زبان سیکھنے کے بعد یہیں بشام میں قالینوں کا ایک شوروم سجائے جاپانی سیاحوں کو اپنی بلکہ ان کی زبان کے دام میں گرفتار کر کے اپنی روزی کماتا تھا.. اور خوب کماتا تھا..

''تارڑ صاحب جب میں جاپانیوں کے ساتھ یکدم جاپانی بولتا ہوں تو وہ غش کھا جاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہے اور جاپانی بولتا ہے.. جب وہ غش کھا جاتے ہیں تو دو ہزار روپے کا لاہوری قالین دس ہزار ڈالر میں بھی خرید لیتے ہیں.. آپ میرے لیے دعا کیجیے۔''

ہم راستے میں نہ صرف بشام میں رُکے تھے.. بلکہ حسب روایت برسین کے موٹل میں ناشتہ بھی کیا تھا.. لیکن اس کے بعد بھی تو کہیں رُکے تھے..

گلگت پہنچنے سے پیشتر کسی اور مقام پر بھی رُکے تھے..

اور کیا مقام تھا جہاں رُکے تھے..

کچھ یاد نہیں پڑتا لیکن پھر بھی یاد آتا ہے کہ کہاں رُکے تھے..

فیری میڈو میں رُکے تھے..

''تاتو کی سرد رات میں بارش میں بھیگتی مُرغیاں''

تاتو میں بارش ہو رہی تھی۔

تاتو میں ٹپک ٹپک.. بوند بوند.. دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی..

اور ہمارے خیموں پر گرتی تھی اور ہم ان خیموں میں دُبکے ہوئے تھے کہ ابھی ہمارے بدنوں پر میدانوں کی گرمی کی جھلساہٹ تھی اور ابھی جہاں سے نانگا پربت کی برفیں چند گھنٹوں کی مسافت پر تھیں وہاں خیمہ زن تھے چنانچہ قابل فہم طور پر سرد ہو رہے تھے ٹھٹھر رہے تھے..

میں نے اس سے قبل ایک بار تاتو میں رات کی تھی.. پہلی بار.. تاتو نالے کے پار گاؤں سے باہر سکول کے کمپاؤنڈ میں.. دوسری مرتبہ میں اپنے خاندان کے ہمراہ چلاس سے چلا تھا اور اسی ندی کے پار ہوا تھا جس کے کناروں پر ہمارے خیمے تھے اور اوپر شام ڈھلے فیری میڈو میں جا پہنچا تھا..

لیکن آج مجھے رات ہو گئی تھی..

باہر بوند بوند برستی اکتی سرد بارش تھی اور ایک چھدرے درخت اور ایک ٹپکتی ترپال کے نیچے خالد ندیم پیاز چھیل رہا تھا اور میاں صاحب اُن دو دیسی مرغیوں کو پکانے کی کوشش کر رہے تھے جو داسو میں پکڑی گئی تھیں.. پکڑی یوں گئی تھیں کہ داسو کے دوکاندار نے کہا تھا کہ حلال شدہ مرغیوں کا سٹاک تو ختم ہو گیا ہے البتہ چند مرغیاں جو میری ملکیت ہیں سامنے ایک کھنڈر میں ٹہل رہی ہیں.. وہ مجھ سے پکڑی نہیں جاتیں کہ پاؤں پہ پتھر لگنے سے چوٹ آ گئی ہے.. آپ خود پکڑ لیں تو آپ کی خاطر میں انہیں حلال کر دوں گا.. شاہد اور میاں نے ''آؤ آؤ'' کر کے انہیں گھیرا، پکڑا اور دوکاندار کے حوالے کر دیا.. اس میں کمال میاں صاحب کا تھا.. چونکہ وہ بازارِ حسن کی قربت میں رہتے ہیں اس لیے گھیرنے اور دانہ ڈالنے میں ماہر ہیں..

ابھی شکار شدہ مرغیوں کو تاتو کی سرد رات میں بارش میں میاں صاحب پکانے اور گلانے کی سعی کرتے تھے.. انہوں نے خود سے تو دیگچی میں پانی نہ ڈالا تھا لیکن اللہ میاں اس میں بارش یوں ٹپکا تا چلا جا رہا تھا کہ مرغیاں باریک شوربے میں ڈوب چکی تھیں..

ہم خود تو خیموں سے باہر نہ آتے تھے، اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں لیٹے ہوئے تھے البتہ وہیں سے میاں اور ندیم کی حوصلہ افزائی کے لیے نعرے بلند کرتے تھے۔ ''میاں صاحب کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.. ندیم باہر زیادہ سردی تو نہیں.. اور سنا ئیں کیا حال ہے؟'' اور میاں صاحب نہایت بدتمیزی سے جواب دیتے۔ ''اوئے تمہارے تو... کو ٹھنڈ ہے اور یہاں باہر ٹھنڈی ٹھنڈ ہے..''

اس پر شاہد نہایت چاپلوسی سے کہتا اپنے سلیپنگ بیگ میں دُبکا ہوا'' میاں صاحب پھر آپ تو ہمارے یار ہیں ناں، یاروں کے لیے قربانی دینا تو بڑے ثواب کا کام ہے..''

''تم باہر آ کر قربانی دے دو.. ثواب کما لو.. آدھی رات کے وقت اس بی پی سردی میں مجھے باورچی بنایا ہوا ہے.. اور یاری کے نام پر بلیک میل کرتے ہو..''

شاہد بالکل چپ..

اتنی دیر میں گرد آمیز کا ایک احتجاج تاتو کی رات میں گونجا'' سائیں گیارہ بج گئے ہیں اور ابھی تک ڈنر سرو نہیں ہوا.. دیری کیوں ہو رہی ہے!''

''ہاں.. سائیں گرد آمیز تو شام کو آٹھ بجے کھانا کھانے کے عادی ہیں تو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے'' گدا نے بھی صدا دی..

ہم سب نے نوٹ کیا تھا کہ سفر کے آغاز میں ہی گدا اور گرد یوں باہم ہوئے تھے کہ بقیہ ٹیم سے سراسر غافل ہو گئے تھے.. اور گدا.. گرد کا یوں تابع ہوا تھا جیسے زرخرید غلام ہو.. اس کے جہیز میں آیا ہو۔

گدا اگرچہ ہمارا قدیمی ساتھی تھا لیکن گرد کی آمد سے وہ یکسر بدل چکا تھا اس کی شکل وشباہت، عادات واطوار سب کچھ بدل چکا تھا.. وہ نہ صرف گرد کا ترجمان ہو چکا تھا سول سپورکس مین ہو چکا تھا.. والی وارث ہو چکا تھا بلکہ ہم سب کو اب حقیر سمجھتا تھا اور ایک خاص تحکم آمیز لہجے میں بات کرتا تھا.. وہ گرد کے ساتھ سرِیش ہو چکا تھا.. ہم انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ نہیں تھے.. اور اس تبدیلی سے ہم سب بے حد دکھی ہوئے لیکن یہ تو محض آغاز تھا.. آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا..

گدا کی اس صدا پر کہ اتنی دیری کیوں ہو رہی ہے.. حیرت انگیز طور پر میاں کی طرف

سے کوئی جواب نہ آیا.. میاں نے یقیناً کچھ نہ کچھ زیر لب کہا ہوگا.. کیا کہا ہوگا.. یہ میاں صاحب کی طبیعت جاننے والے جانتے ہیں کہ کیا کہا ہوگا..

تاتو کی سرد رات، بارش، ٹپکتی ترپال کے نیچے مرغی شوربے میں تیرتی ہوئی.. ایک برس کی قید تہذیب کے بعد ویرانے میں آزادی کی پہلی رات.. اپنے خیمے میں.. تاتو میں..

''بشام، برسین، بامیان اور رائے کوٹ پُل''

ابھی کل کی بات ہے جب ہم لاہور سے چلے تھے.. سیتا اور رام کے بیٹے لوہ کے شہر لاہور سے چلے تھے..

رات حسب خصلت بشام میں کی تھی..

عمران نے اپنی ڈاکومنٹری کا آغاز یہیں سے کیا تھا.. کیمرے کو مجھ پر آن پہلی بار کیا تھا۔

بشام موٹل کے بلندی سے مجھے نیچے سندھ کی سلیٹی چادر کی کروٹوں تک لے گیا تھا..

مجھے ایک پتھر پر بٹھا کر شیر دریا کو تکتے ہوئے شوٹ کیا تھا" تارڑ صاحب آپ سندھ کے پانیوں کے سحر میں مبتلا انہیں دیکھتے چلے جاتے ہیں اور آپ کو اپنے پرانے سفر یاد آتے چلے جاتے ہیں.. آپ نے بولنا کچھ نہیں.. سائیں سندھ میں گزشتہ زندگی کی تصویریں دیکھنی ہیں.. جیسے یہ ایک البم ہو جس کے ورق خود بخود الٹتے بہتے جا رہے ہوں"

سندھ کی چادر میں گزشتہ زندگی کے دھاگے بُنے ہوئے تھے.. ان دھاگوں سے تصویریں بنتی تھیں..

ان میں شاہ گوریاں بہتی چلی جاتی تھیں..

کرومبر جھیل کے پانی یوں شامل ہوتے تھے کہ سندھ میں سے اُن کے ملاپ سے ایسی مہک اٹھتی تھی کہ میرے تن بدن کو رنگتی اور مشک آور کرتی تھی..

سنولیک کی تتلیاں بہتی چلی جاتی تھیں..

فیئری میڈو کی برفوں میں سے نکلنے والا سٹرابیری کا پہلا سفید رنگت پھول تیرتا جاتا تھا۔

برجی لاء کے سفید اُبھار سندھ کے ستواں پیٹ کے اوپر اُبھرتے تھے.....

درکوت گلیشیر کے لب کھلتے تھے.. اس کے گھاؤ گہرے ہوتے دکھائی دیتے تھے..

کیا کیا نہ اس سندھ سائیں کی کروٹوں میں دکھائی دیتا تھا.. لیکن میں چپ تھا.. مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں نے بولنا نہیں.. محض خواب دیکھنے ہیں.. ان کا اظہار نہیں کرنا.. شیر دریا کی موجوں کو تکتے اپنے پچھلے سفروں کو یاد کرنا ہے.. آنکھوں سے اور چہرے سے.. اور میں نے ایسا ہی کیا..

اگر رات حسب خصلت بشام میں ہوئی تو اگلی سویر ہم نے ناشتہ حسب عادت شاہراہ ریشم سے بلند ہو کر کھائیوں میں پاگل ہوتے.. پاگلوں کی مانند منہ سے جھاگ نکالتے.. اباسین پر معلق برسین کے موٹل میں کیا.. اور اس موٹل کی ویران اور تنہا بلندی نے ایک مرتبہ پھر مجھے اداسی اور کسک سے دوچار کیا.. اس کے کسی ایک کمرے میں بھی نہ بھی میری اداسی اور کسک اختتام کو پہنچ سکتی تھی.. کسی عشق خاص کی موجودگی میں فیصلہ ہو سکتا تھا کہ یہ سب دوری کی نارسائی ہے یا قربت کا ملی ڈوز راسے ملیا میٹ کر سکتا ہے.. عجیب نام تھا برسین.. جو ایک چارے کا نام بھی ہے.. اور یہ ایک شہر کا نام بھی ہو سکتا ہے.. برزبین..

بشام سے چلے ہیں تو داسو میں جا رکے ہیں، مرغیاں پکڑنے کے لیے..

داسو کے پُل پر جتنے بھی خوش نظر اور عمدہ جمال کے چینی شیروں کے معصوم مجسمے تھے ان میں سے بیشتر بت شکنوں کے جذبۂ ایمانی کے نتیجے میں ٹوٹ چکے ہیں.. اُن کے دھڑ باقی ہیں اور چہرے ایمان کی قربان گاہ پر نچھاور ہو چکے ہیں۔

یہ گویا ایک ٹریلر تھا..

ایک فل لینگتھ فلم کا جو ایک برس بعد پوری دنیا کو دکھائی جانی تھی..

ہزاروں برسوں سے موجود.. دنیا کے سب سے بلند.. ایک عظیم چٹان میں سے تراشے ہوئے بامیان کے بدھ مجسمے.. جنہیں بت شکن محمود غزنوی نے بھی متروک ہو چکے عقیدے اور خدا کے طور پر ہاتھ نہیں لگایا تھا اُن پر برادران طالبان نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر.. راکٹوں.. اینٹی ایئر کرافٹ گنوں اور بارود کے ڈھیروں سے حملہ کر دیا.. بے شک افغانستان کی نصف آبادی بھوک سے مر رہی تھی.. بچے سردی سے ٹھٹھر کر منجمد ہوتے تھے، خواتین اپنے بدن ایک روٹی کے لیے فروخت کرتی تھیں اور لاکھوں افغان ہاتھ کفار کی جانب سے فراہم کردہ خوراک کے حصول کے لیے بلند رہتے تھے.. لیکن برادران طالبان پتھروں سے جنگ کرتے تھے..

اس جنگ کا آغاز شاید داسو برج کے شیروں کو توڑنے سے ہوا تھا..

میں متعدد بار افغانستان گیا ہوں ..کبھی سرسری گزرا ہوں ..کبھی قیام کیا ہے ..یہ لینڈ سکیپ کی وسعت اور آبائی ویرانی کے حوالے سے اب بھی میرے پسندیدہ ملکوں میں سے ہے ..اور ہر بار میں نے کوشش کی ہے کہ میں کابل سے بامیان جا سکوں ..اس وادی میں داخل ہوتے ہوئے بدھ کے عظیم مجسموں کو ایک پہاڑی سلسلے کی چٹانوں میں سے ..بہت دور سے ..ظاہر ہوتے دیکھ سکوں ..شاید سرشام ..شاید سویر کی ہلکی دھوپ میں ..اور پھر ان مجسموں کے عقب میں ..چٹانوں میں کھدے جو راہب خانے ہیں ..ان میں قیام کر سکوں ..ان کی دیواروں پر جو ہزاروں برس پہلے کی تصویریں ہیں انہیں نظروں میں اتاروں ..بدھ راہبوں کی ان کوٹھڑیوں میں سے بدھ کے پتھر پیلے پیراہنوں کے پار وادی بامیان کے جو منظر ہیں ان پر نظر کروں ..کبھی سرشام ..کبھی سویر کی ہلکی دھوپ میں ..

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

کبھی مجھے ہرات پہنچنے کی جلدی تھی ..

اور کبھی ..بامیان جانے والی بس جا چکی ہوتی تھی۔

چنانچہ ایسا نہ ہو سکا ..

اور اب ..میں نے جو تصویریں دیکھی ہیں ان میں باریش طالبان نہایت تکبر سے بامیان کے گاؤں میں کھڑے ہیں اور ان کے عقب میں جو چٹانیں ہیں ان میں خلا ہیں ..خلا موجود ہیں ..گوتم کے ..دنیا میں سب سے بلند ڈیڑھ ہزار برس قدیم مجسمے موجود نہیں ..ایک اخبار نے اطلاع دی کہ ان مجسموں میں سے ایک کا ایک بازو ابھی تک موجود ہے جو تباہ نہیں کیا جا سکا ..

میں اب بھی اس ایک بازو کے لیے بامیان جانا چاہتا ہوں۔

لیکن ہم تو داسو میں تھے ..بامیان میں نہیں تھے ..ہم آگے بڑھ گئے ..

پل کے پار گئے اور سندھ کے دوسرے کنارے پر سفر کرنے لگے ..

یہیں وہ پہلی آبشار آئی۔

شدید گرمی میں اس کی پھوار بدن کو زندہ کرتی تھی ..

لیکن بلندی سے اترتی ہوئی اس آب رواں کے اردگرد پانی کے بولے تھے جو اس کے گرنے سے دوہرے ہوتے تھے۔

یہاں مجھے اسلام آباد کی ایک پارٹی میں نہایت وسیع الخلق سے بغل گیر ہونے والے

ایک سینئر بیوروکریٹ چیمہ صاحب یاد آ گئے ..

"تارڑ صاحب ..ہم بھی آپ کے شمال گئے تھے ..آپ کے سفرنامے پڑھ پڑھ کر گئے تھے .."

"کہاں گئے تھے"

"یہ تو کچھ یاد نہیں کہ کہاں گئے تھے بس یہ یاد ہے کہ داسو کے پل کے پار شاہراہ ریشم پر ایک آبشار گرتی تھی ..اور ہم نے اپنے گلاسوں میں بلیک لیبل انڈیل کر انہیں اس آبشار کے ٹھنڈے پانیوں سے لبریز کیا تھا ..اور پھر وہیں رات ہو گئی تھی .."

"سر آپ کتنے روز وہاں ٹھہرے تھے .."

"یہ بھی یاد نہیں ..بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہم سکاچ وسکی کے دو کریٹ اور بیئر کے چار کریٹ وہاں رہے تھے ..ہم دیوسائی بھی گئے ..معلوم نہیں وہاں کتنے دن ٹھہرے ..بس یہ یاد ہے کہ وسکی کی پانچ بوتلیں اور بیئر کی بیس بوتلیں ٹھہرے ..ہمارا حساب کتاب بس اس حساب سے ہوتا ہے ..دن وغیرہ بھول جاتے ہیں .."

اس آبشار کے آگے چلاس تھا ..تتا پانی تھا ..اور پھر شام ہوئی تھی جب رائے کوٹ کا پل نظر آیا تھا ..

رائے کوٹ کے پل پر میلہ لگا تھا ..چائے خانے کھل چکے تھے ..درجنوں جیپیں سیاحوں کو تاتو تک لے جانے کی منتظر تھیں ..شنگریلا کے بے آباد ہوٹل کے گیراجوں میں اوپر گئے ہوئے سیاحوں کی کوسٹر اور کاریں کھڑی تھیں ..

کبھی یہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اور جب یہاں کچھ بھی نہ تھا تو صرف میں تھا ..اور بے یقینی اور خوف تھا اور میرا خیمہ تھا۔ پل کے دامن میں جہاں ریت اب بھی کچھ دبی ہوئی لگتی تھی شیر دریا کے عین اوپر میرا خیمہ تھا ..ہر شام بونداروچ کی تیز دھار اور بلند چٹانوں سے چند پورٹر اترتے تھے جن میں سے مولوی رحمن اور قدم خان اور ان کے دو گدھے میرے سامان کے نصیب میں تھے ..پل کے پار ایک [illegible] تھی اور اس کے پیچھے تھے ..اور کچھ نہ تھا ..نہ تاتو تک جاتی روڈ تھی نہ جیپیں تھیں اور نہ چائے خانے تھے ..کچھ بھی نہ تھا سوائے خوف اور بے یقینی کے ..کیا معلوم اوپر کہیں فیری میڈوز نام کی کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں ..میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملا تھا جو وہاں تک جا چکا تھا ..اور اب ہر دوسرا شخص جا چکا تھا۔

جیپ پر سوار ہو کر تاتو تک..اور پھر چند گھنٹوں کی چڑھائی کے بعد فیئری میڈو..میں بھی تو اپنے بال بچوں سمیت آج سے آٹھ برس پیشتر اسی طور اوپر گیا تھا..اور پہلی بار کب گیا تھا..شاید سترہ برس..اٹھارہ برس..یا شاید سو برس پہلے جب تاتو کے گاؤں تک پہنچنے کے لیے بولڈر رج کی قہر انگیز گرمی اور بلندی پر چلنا پڑتا تھا..کئی کوہ نورد آدھے راستے سے واپس آ جایا کرتے تھے..

اس بار ہمارے پاس ایک ذاتی کوسٹر تھا جو ہماری مرضی کا تابع تھا..بے شک رائیکوٹ میں رُک کر مرغیاں پکڑ لیں..اس کوسٹر کو ایک گیراج میں بند کر کے تین جیپیں حاصل کی گئیں ان میں سے ایک میرے دوست رحمت نبی کی ذاتی جیپ تھی جو خصوصی طور پر مجھے لینے کے لیے اتری تھی..

عمران بابر اینڈ کمپنی رائے کوٹ پل پر اترتے ہی متحرک ہو چکی تھی..

''سر جی..'' عمران نے بیک وقت اپنی نیکر ٹٹولتے اور عینک درست کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا'' شوٹنگ شروع کرتے ہیں..''

''تو کر دو..''

''نہیں سر پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ڈاکومنٹری کی بنیادی تھیم کیا ہوگی..اس کو ذہن میں رکھ کر شوٹ کریں گے''

''تھیم یہ ہوگی کہ ایک شخص..یعنی کہ یہ فقیر حقیر بندۂ پرتقصیر..اٹھارہ برس پیشتر یہاں آیا تھا..بولڈر رج کے راستے تاتو اور پھر وہاں سے فیئری میڈو پہنچا تھا اور اس نے اپنے اس مہماتی سفر کو'' نانگا پربت''میں بیان کیا تھا اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سوں نے اُدھر کا رخ کیا تھا..تو تھیم یہ ہوگی کہ ایک نسبتاً نوجوان شخص جب پہلی بار فیئری میڈو گیا تھا تو وہ کیا تھا..اور اب ایک نسبتاً بوڑھا شخص وہاں پہنچے گا تو وہ کیا ہوگا..

''شوٹ..'' عمران نے حکم دیا..اور شوٹنگ شروع ہوگئی..

اور شوٹنگ شروع ہوئی تو تاتو تک پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی..تاریکی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شمال کی خوفناک ترین روڈ پر جب ہماری جیپیں اُچھلتی اور گھومتی جاتی تھیں تو ہم کچھ دیکھ نہ سکتے تھے..نہ گہرائی میں گم نالے کو..نہ سڑک کی خطرناکی اور ہولناک موڑوں کو..اس لیے ہمارے دل اپنے مقام پر ٹھہرے رہے اُچھل کر حلق میں نہ آئے..البتہ نیم تاریکی میں نالے کے دوسری جانب آسمان رفعتوں کی بولڈر رج میں وہ چھوٹا سا راستہ دکھائی دیتا تھا جس پر میں چلا تھا..اور یہاں سے یہ سو فیصد ناممکن لگتا تھا کہ کوئی ذی روح اس پر چل بھی سکتا ہے..

تاتو میں رات ہوگئی تو ہم اوپر نہیں جا سکتے تھے اس کے ندی کنارے کے ہوٹل کی کیمپنگ میں خیمہ زن ہو گئے..اور پھر بارش شروع ہو گئی..

ندیم پیاز چھیل رہا تھا..میاں مرغیاں پکا رہا تھا اور اُن میں بارش کا پانی ٹپ ٹپ گرتا تھا..

ہم اپنے خیموں میں دُبکے ہوئے تھے اور سردی ہڈیوں کے گودے کو جاتی تھی..نانگا پربت اوپر کہیں تنگی تھی اور بہت ہی ننگی تھی..

ہائے اللہ جی میں کیا کروں..شمشال کبھی کا دیدار...

سو چہروں والی نانگا پربت کی برہنگی

شب گزر رہی گئی..جو ہم پہ گزری سو گزری،سویر ہو گئی..

کیا نکھری ہوئی کنوارے جوبن کی سویر تھی..جو فضا تھی گویا خنک نمی کا باریک شیشہ تھا جو سانس لینے سے ٹوٹتا تھا،جو ہوا تھی اس میں جنگلی بوٹیوں کا نشہ ہی نشہ مہکتا تھا،اور قربت یار میں جو مدھم آنچ آتی ہے ایسے نانگا پربت کی قربت سے سرد سندیسے آتے تھے کہ میں تمہارے قریب ہوں..

ہمارے سامان کو اوپر تک لے جانے کے لیے حسب معمول ایک ہنگامہ سا ہوا تھا..پھر لاٹری کے ذریعے فیصلہ ہوا کہ کن خوش نصیبوں کے حصے میں ہمارا سامان آئے گا..خوش نصیب اس لیے بھی کہ انہوں نے دو تین گھنٹوں کے اندر اندر اوپر پہنچ جانا تھا اور ہم سے چار سو روپے فی کس ہتھیا لینا تھا..یہ صرف شمال کے نہیں پاکستان کے بھی مہنگے ترین پورٹر تھے اور کوہ نوردوں کا خون نچوڑ لینے پر قادر تھے..یہاں بندہ مزدور کے اوقات ہرگز تلخ نہ تھے..

پورٹر ہمارا سامان اپنے کندھوں پر بوجھ کر کے روانہ ہو چکے تھے۔

کچھ ساتھیوں نے متروک شدہ سڑک پر چل کر اوپر پہنچنے کو ترجیح دی..یہ راستہ اگرچہ طویل تھا لیکن باقاعدہ اور قدرے آسان تھا..

فنتوری والا راستہ کب کا ترک ہو چکا تھا لیکن مجھے ایک اٹھارہ برس پرانے خواب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اسی راستے سے اوپر جانا تھا..اور میں جانتا تھا اگر چاہا تو جان سے جاتا تھا..

لیکن یہاں شوٹنگ کے آغاز سے پیشتر ایک قضیہ ہو گیا..

پہلے تو میں ایک خاموش اداکار تھا..لیکن آج مجھے کیمرے سے مخاطب ہو کر بولنا تھا تو عمران نے مجھ سے پوچھا ''سر زبان کونسی ہو گی؟''

''کس کی زبان؟''

''آپ کی زبان سر..ماشاء اللہ یو لینگویج سر..ڈاکومنٹری میں آپ ہمارے بڈھے شیر ہیں تو یہ شیر دیکھنے والوں سے کس زبان میں گفتگو کرے گا..''

''شیر تو صرف دھاڑتا ہے عمران!''

''آپ اگر دھاڑنے کے قابل ہوتے تو میں یہ سوال پوچھتا! طے کرنا ہو گا کہ آپ کونسی زبان میں منظر کو بیان کریں گے''

''میرا خیال تھا کہ ہم صرف شوٹ کریں گے اور بعد میں اطمینان سے بیک گراؤنڈ کومنٹری ریکارڈ کر لیں گے..''

''نہیں سر یہ دراصل ڈاکومنٹری نہیں ہو گی بلکہ ڈرامہ ہو گا..اور ڈرامہ آپ کریں گے..اپنی اداکاری کے زمانوں کا تجربہ سامنے لائیے اور بولیے..تو کونسی زبان میں بولیں گے؟''

''وہ..میں ذرا گھبرا گیا ہکلا گیا'' بھئی فی البدیہہ بولنے کے لیے بھی کچھ تیاری کرنی پڑتی ہے..ذہن میں ایک سکرپٹ بنانی پڑتی ہے..تو یہ ہے کہ..بس اردو چلے گی اور پنجابی لہجے میں بہت ہی چلے گی..''

''نہ جی..''عمران جو کبھی کبھی قدرے نسوانی ہو جاتا تھا یہ ''نہ جی..'' کہتے ہوئے ہو گیا ''ہو سکتا ہے ہمارا معاملہ کسی ڈسکوری یا نیشنل جیوگرافک ٹائپ کی غیر ملکی چینل سے طے پا جائے تو..آپ انگریزی بولیں گے..''

''انگریزی؟'' میں مزید گھبرا گیا مزید ہکلا گیا ''یار میری انگریزی بڑی کمزور ہے''

''وہ تو آپ کی اردو بھی بڑی کمزور ہے سر جی'' یہ کاظمی تھا ایک ہنستا ہوا انگر بگڑ ہو گیا..

''شٹ اپ کاظمی..''

''سوری سر..آئی ایم شٹ اپ'' اس نے اپنا قہقہہ سمیٹ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا..

''سر جی'' عمران نے مجھے تسلی دی ''آج کل انگریزی کمزور ہی چلتی ہے بلکہ آپ جتنی اوٹ پٹانگ انگریزی بولیں گے باہر کے ویورز زیادہ پسند کریں گے..ذرا مشرقی اور نہایت پُراسرار ماحول پیدا ہو جائے گا..تو بسم اللہ کیجیے..''

''بسم اللہ کی انگریزی کیا ہوتی ہے''

''بسم اللہ آپ بے شک پنجابی میں بولیے اور اس کے بعد بلا سوچے سمجھے جو جی میں آئے بولتے جایئے''

''ہاں اگر میں سوچ سمجھ کر بولوں گا تو کچھ نہیں بولوں گا.. یہ بہتر ہوگا کہ میں آج کل کے پرندو کمپیوٹرز کی مانند بے دریغ اور بلا سوچے سمجھے انگریزی بولتا جاؤں''

''تو بسم اللہ..''

میں سڑک پر گرنے والے ایک خنک چشمے سے اپنا چہرہ تر کرتا ہوں۔ ہاتھ جھٹک کر چند چھینٹے اڑاتا ہوں اور پھر سڑک کے کنارے اٹھتے متروک شدہ راستے پر چڑھنے لگتا ہوں.. یہ نہایت کٹھن چڑھائی ہے.. میں دو چار قدم اٹھانے کے بعد ہونکنے لگتا ہوں.. میرا دم پھولنے لگتا ہے.. پھول کر کُپا ہو جاتا ہے.. میں رُکتا ہوں.. کسی پتھر کا سہارا لیتا ہوں اور جب دم کُپا سے قدرے پتلی ہو کر سمٹتا ہے تو اسے سنبھالتا پھر سے چڑھنے لگتا ہوں اور مجھ پر وہ گانا آشکار ہوتا ہے کہ کی دم دا بھروسہ یار.. دم آوے نہ آوے..

میں آہستہ آہستہ چڑھ رہا ہوں اور عمران اور اس کے دونوں بغل بچے پتہ نہیں کیا کیا پیچیدہ آلات تصویر کشی تھامے میرے پیچھے یوں چلے آتے ہیں جیسے میرا شکار کرنے کو آئے ہوں.. مجھے تج بچ شوٹ کرنے آئے ہوں..

تاتو پیچھے رہ گیا..

نہایت پیچھے رہ گیا..

نیچے بہت نیچے پہاڑ کے پیندے میں نظر آنے لگا..

پچھلی شب جہاں ہمارے خیمے نصب تھے وہ مقام فضائی منظر ہو گیا..

وہی مقام جہاں رات کے بارہ بجے سرد بارش کی کپکپاہٹ میں ہم نے شکار شدہ مرغیاں کھائی تھیں۔ اس سے بہتر طعام تاکا پربت کو زیر کرنے والے جرمن کو وہ پیاہرمن بوہل کے نصیب میں بھی نہ ہوگا.. اگرچہ گدا اب بھی احتجاج کرتا تھا کہ سائیں گرد کے ڈنر کو دیری ہو گئی ہے اور شوربہ بہت پتلا ہے.. ان مرغیوں کی ہڈیاں اس کیمپنگ میں ابھی تک بکھری ہوئی تھیں لیکن اس بلندی سے نظر نہ آتی تھیں.. ہم اتنے بلند اور اونچے ہو چکے تھے..

عمران اپنی نیکر ٹٹول کر.. داڑھی کھجلا کر اپنی ایئر ہوسٹس بیگم کو اس عمل کے دوران یاد

کر کے ایک آہ بھر کے شاٹ کا تعین کرتا'' سر جی آپ اس خطرناک کنارے کے اوپر چلیں گے اور میرا کیمرہ آپ کے جوگرز پر ہوگا.. اور آپ نے چلتے ہوئے جان بوجھ کر اس کنکر کو ٹھوکر مارتے گزرنا ہے.. میرا کیمرہ اس کنکر کو ڈھلوان پر سے گرتے ہوئے فالو کرے گا اور یہ کنکر کہیں گہرائیوں میں گم ہو جائے گا.. تاکہ یہ اسٹیبلش کیا جا سکے کہ آپ کتنی خطرناک بلندی پر چل رہے ہیں.. اپنی جان کو داؤ پر لگا رہے ہیں..''

''لیکن عمران! اس کنکر کو ٹھوکر مارتے ہوئے یہ نہ ہو کہ میں اپنا توازن کھو دوں اور خود بھی لڑھک جاؤں''

''اس کی آپ پروا نہ کریں.. اگر آپ لڑھک جائیں گے تو میرا کیمرہ آخری دم تک آپ کو فالو کرے گا.. تا آنکہ ہر سو خاموشی چھا جائے اور ہر کوئی جان جائے کہ ایک مصنف ایک کوہ نورد بالآخر ہمیشہ کے لیے کھائیوں میں گم ہو چکا ہے''

''یعنی تم اور تمہارے بغل بچے میری مدد کو نہیں آئیں گے؟''

''نہیں سر.. ہم آپ سے زیادہ آپ کے آخری شاٹ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ ہم کمینے لوگ ہیں''

جو خود اقرار کرتے ہوں کہ وہ کمینے ہیں تو انہیں کمینہ کہنے سے فائدہ!

دراصل وہ بھی تمنا رکھتے تھے..

اس آس میں تھے کہ میں کسی بلندی سے لڑھک جاؤں اور وہ ایک تاریخی شاٹ شوٹ کرنے میں کامیاب ہو جائیں.. ان کی کمینگی کی کوئی حد نہ تھی..

عمران ہدایات جاری کرتا رہا'' یہاں سے گزر کر آپ اس سالخوردہ نہایت تجریدی اور سوکھے ہوئے درخت کے تنے میں داخل ہو کر دوسری جانب نکلیں گے اور یکدم آپ اپنے آپ کو ایک انتہائی پُر خطر بلند کنارے پر پائیں گے اور خوفزدہ ہو جائیں گے لیکن پھر بھی مسکرائیں گے کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا.. اور پھر آہستہ آہستہ چلتے اس جھاڑی کے عقب میں روپوش ہو جائیں گے اور ہاں.. کوشش کیجیے کہ چلتے ہوئے آپ جوگرز کو سنگریزوں پر ذرا گھسیٹ کر چلیں تاکہ میں اُن کی ساؤنڈ ریکارڈ کر سکوں.. تو بسم اللہ''

انسان کو کتنی شہرت اور سستی ناموری کے لالچ میں کیا کیا نہیں کرنا پڑتا.. اور میں نے بھی کیا.. یعنی کیا کیا.. کیا۔

اور پھر اکثر اوقات عمران اپنی ندامت شرمندگی سے کھجلانے لگتا۔ ''سوری تارڑ صاحب.. میری غلطی ہے.. میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا.. آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن ذرا پھر سے نیچے اُتر جائیں اور دوبارہ اسی راستے پر چڑھتے ہوئے اوپر آ جائیں۔''

میں واقعی اس روزِ بد کو کوستا تھا جب میں نے اس ڈاکومنٹری میں معاونت کی حامی بھری تھی.. بوجھل قدموں سے گرتا پھسلتا پھر نیچے چلا جاتا کبھی بیس فٹ نیچے جاتا اور کبھی بیس میٹر اور پھر کشمیری ہاتو کی مانند سر جھکا کر پہاڑ پر چڑھنے لگتا.. اس روز کم از کم تین بار میں تقریباً فنتوری تک پہنچا.. پھر تقریباً تاؤ تک نیچے آیا اور پھر چڑھا..

چنانچہ میری ٹانگوں میں جتنی مچھلیاں تھیں وہ پھڑک پھڑک کر ساکت ہو گئیں..

جتنی رگیں تھیں وہ پھٹنے کو آ گئیں..

اور جتنے وٹّے تھے وہ چڑھ گئے اور اُلّو کے پٹھے ہو گئے..

اور مجھ میں ارادے اور ہمت کے جو چند ایک بلب ابھی تک ٹمٹماتے تھے وہ سب فیوز ہو گئے..

لیکن خود کردہ را علاج نیست.. میں نے جان بوجھ کر یہ بی پی پنگھا لیا تھا..

لیکن ایک بات نے مجھے بے حد حیران کیا.. میں سمجھتا تھا کہ عمران، کاظمی اور طاہر نیشنل کالج آف آرٹس کے نُنّا کلچر کے نمائندے ہیں.. اگرچہ آرٹی کرافٹی ہیں.. لیکن قدرے نسوانی ہیں.. تھوڑے اَفیمی ہیں بہت چرسی ہیں اور یہ پورا وقت اونگھنے میں یا ہوا میں انگلیوں سے تصویریں بنانے میں گزاریں گے.. لیکن جب ان تینوں نے اپنے آلاتِ تصویر کشی و صوت سنبھالے تو ان کی پھرتی.. ہمت اور اَن تھکی نے مجھے حیران کر ڈالا.. وہ پارے کی مانند متحرک اور بے چین ہو گئے..

میں تو ان کے لیے ایک انسان نہ تھا بلکہ کسی جنگلی حیات کے پارک میں کسی شیر سے جان بچاتا ہوا ایک لومڑ تھا جسے وہ فالو کر رہے تھے.. اسے فلم بند کر رہے تھے.. بالآخر فنتوری کا طلسمی دروازہ آ گیا..

اس چوبی گیٹ پر میں نے اٹھارہ برس پیشتر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور اسے ایک اَن جانی بہشت میں داخل ہونے کے لیے دھکیلا تھا۔ آٹھ سال پہلے میری بیٹی عینی نے اسے وا کیا تھا اور میمونہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے بے دم ہو کر اس کے ساتھ کمر لگا کر سستانے لگی تھی..

مجھے اس پھاٹک میں سے بھی متعدد بار گزارا گیا.. واپس لایا گیا.. پھر سے گزارا گیا..

شوٹنگ کا مرحلہ طے ہوا تو ہم اس پھاٹک کے پار ہوئے..

پار فنتوری تھی..

فنتوری ایک فینٹسی..

لیکن پار ہوئے تو پار کچھ بھی نہ تھا..

نہ فینٹسی تھی.. نہ

فنتوری تھی..

میں جو اس کی آتشِ دید میں بھڑکتا چلا آیا تھا.. بھک سے بُجھ گیا..

پار کچھ بھی نہ تھا..

فنتوری ایک اُجڑا ہوا میلہ تھا..

دھول اُٹھتی تھی.. جھرنے اور چشمے خاموش پڑے تھے.. خشک پڑے تھے اور اُن کی نالیوں اور گزرگاہوں سے دھول اُٹھتی تھی.. سرد پانیوں کی نہریں، ویران اور بیوہ ہو چکی تھیں.. اُن کی ترل ترل اور نغمگی ایک قصۂ پارینہ تھی..

کوئی ایک.. صرف ایک ہی.. کوئی پھول نہ تھا..

خنکی کا ایک جھونکا نہ تھا..

سیاہ گلابوں کی جھاڑیاں پژمردہ اور کسی ایک بھی پھول سے ناآشنا.. اور سامنے بھی.. کچھ نہ تھا.. ناگا پربت کی برفوں کے انباروں کا ایک سفید ذرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.. وہاں گھنے بادل تھے..

وہ جنت کیسی جس میں نہریں نہ چلتی ہوں.. وہ باغِ ارم کیا جس میں کوئی پھول نہ ہو اور وہ فنتوری کیا جس کے اوپر ناگا پربت کی برفیں حکمران نہ ہوں..

میں نہ صرف بجھ گیا بلکہ بے حد خجل اور شرمندہ بھی ہوا اور مجھے یقینِ محکم تھا کہ اس بے روح اُجڑے ہوئے منظر کو دیکھ کر عمران اور اس کے دونوں بغل بچے مجھے مشترکہ طور پر زدوکوب کرنے لگیں گے کہ سرجی اپنے سفرناموں میں اتنی دروغ گوئی کرتے ہو.. یہ ہے کہ آپ کی فنتوری ایک فنٹیسی.. ایسی ہوتی ہے فنتوری..

لیکن صاحبو! ایک عجیب ناقابلِ یقین وقوعہ ظہور پذیر ہوا.. یعنی جونہی ہم پھاٹک پار کر کے فنتوری کے اس اجڑے ہوئے میلے میں داخل ہوئے تو اسے اپنے سامنے پا کر عمران

باقاعدہ غش کھا کر گرنے کو تھا کہ کاظمی اور طاہر نے اسے سنبھال لیا۔

اگرچہ یہ محرم کے ابتدائی ایام نہ تھے لیکن عمران سینہ کوبی کرتا ماتم کرنے لگا۔ ''ہائے اللہ جی.. ہائے اللہ جی..''

یہ بندہ اداکاری کر رہا ہے یعنی مجھے زدوکوب کرنے سے پیشتر اس لئے میں اپنے دفاع کی خاطر شرمندگی سے باہر آ کر بظاہر غصیلا ہو گیا ''اوئے تمہیں ہوا کیا ہے؟''

''ہائے اللہ جی''.. وہ ماتم کرتا رہا..

''عمران, تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہائے اللہ جی..'' اس نے مجھ سے مخاطب ہونا ضروری نہ سمجھا اور براہ راست آسمان سے باتیں کرنے لگا ''ہائے اللہ جی.. میں اب کیا کروں.. آپ نے مجھے یہ کیوں دکھایا.. اور اب جا کر کیوں دکھایا پہلے کیوں نہیں دکھایا، اللہ جی ہم آپ سے نہیں بولتے.. آپ کی اور ہماری کٹی..''

عمران اس اُجڑی ہوئی فنتوری کو دیکھ کر بھی حواس کھو بیٹھا تھا اور بین کیے چلا جا رہا تھا۔ ''میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات.. یعنی اگر مری نتھیا گلی اور کاغان ہیں تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے.. یعنی باقی کیا ہے.. لیکن اللہ جی یہ کیا ہے..'' پھر وہ مجھ سے گلے گزاریاں کرنے لگا۔ ''کیوں تارڑ صاحب آپ یہ مجھے کہاں لے آئے ہیں.. سر جی آپ نے یہ کیا بنا دیا ہے؟''

''میں نے نہیں اللہ میاں نے بنایا ہے اور یقین کرو عمران میں نے ''نانگا پربت'' اور ''پاک سرائے'' میں حقیقی طور پر رنگ آمیزی نہیں کی تھی کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا.. یہاں واقعی جب میں آیا تھا تو برفیلے پانیوں کی روانی راج کرتی تھی.. ان کے گیت اس فضا کو نم کرتے تھے، یہاں گلاب کی جھاڑیوں کے پتے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے.. بھنوروں کی بھنبھناہٹ اور تتلیوں کی پھڑ پھڑاہٹ اڑتی ہوتی تھی اور سامنے نانگا پربت کی برفیں اندتی آتی تھیں اور آنکھوں میں بھی برف بھرتی تھیں.. لیکن.. پتہ نہیں ہم کون سے موسموں میں ادھر آ نکلے ہیں کہ یہاں اب کچھ بھی نہیں ہے.. آئی ایم سوری''۔

''یہ اچھا ہے کہ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے.. اگر وہ سب کچھ یہاں ہوتا جو آپ کہہ رہے ہیں تو پھر یہاں سے مرا جنازہ ہی اٹھتا.. ہائے اللہ جی!''

شاید عمران کے لیے جتنی بھی اور جیسی بھی فنتوری تھی کافی تھی، اس کے لیے تہہ در تہہ رائے کوٹ گلیشیر کے بلند کنارے پر بچھے سرسبز کھیت، ان کی ہریالی میں لکڑی کے دیدہ زیب

جھونپڑے جن میں مویشی بھی تھے اور انسان بھی.. ایک بہت ہی بلند سرد موجودگی.. آسمان کی قربت، جھاڑیوں میں گم ہوتی پگڈنڈیاں، دنیا جہان سے کٹی ہوئی اور بہت بلند پہاڑوں کی تنہائی اور ابھی ابھی سامنے ایک سپاٹ افق میں سے گہرے بادلوں کے ایک کونے میں سے دکھائی دینے والی نانگا پربت کی برفوں کے ایک مختصر حصے کی ایک واجبی سی جھلک ہی کافی تھی..

شاید میں موازنہ کر رہا تھا اور اس کے پاس کوئی پیمانہ نہ تھا..

اس کے لیے فنتوری اس کی زندگی میں آنے والا پہلا عشق خاص تھا جو اس کے سامنے تھا.. اس نے کسی اور کو دیکھا ہی نہ تھا اس لیے اور میرے لیے اجڑی ہوئی فنتوری کو دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہو گیا تھا بلکہ جاں بحق ہوتے ہوتے بچا تھا..

کاظمی، طاہر بھی متاثرین میں شامل تھے لیکن وہ چپ تھے.. اظہار نہیں کر رہے تھے..

عمران کی حالت مسلسل غیر ہوتی چلی جا رہی تھی..

''ہائے اللہ جی، ہائے اللہ جی'' وہ مسلسل شکایت کر رہا تھا..

''کاظمی''

''جی سر'' وہ دانت نکالتا حاضر ہو گیا..

''یار اپنے باس کا کچھ کرو ورنہ یہ شہید ہو جائے گا''

''کچھ کر دوں سر؟''

''ہاں کر دو''

''ایک ہی علاج ہے سر.. آپ اگر اجازت دیں تو ہتھیلی پر مسلے ہوئے تمباکو سے ایک سگریٹ تیار کر کے باس کو سوٹے لگوائے جائیں.. اگر آپ اجازت دیں تو..''

''اجازت ہے''

''تو سر اگرچہ ہم ظاہر نہیں کر رہے.. یعنی میں اور طاہر.. ظاہر نہیں کر رہے لیکن اس منظر کو دیکھ کر ہم بھی نومیدگی کے قریب ہیں..''

''تو پھر..''

''تو پھر یہ کہ.. ایک نہیں تین سگریٹ تیار ہوں گے.. اگر آپ اجازت دیں''

''پھر اجازت ہے''

چنانچہ کاظمی نے فوراً نہایت چابکدستی سے تین عدد سگریٹ مینوفیکچر کیے جن کا سکون

آور دھواں ان کے حلق میں اترا اور نہ صرف وہ دونوں بلکہ عمران بھی کچھ بحال ہوا..

بحال ہونے پر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پہلے میرے قدم چھوئے اور پھر میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا'' سرجی آپ گریٹ ہیں..آپ ہم کمینوں کو یہاں لے آئے..اب حکم کریں کہ میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

''تم یہ کرو کہ اپنے کیمرے اور مائیک وغیرہ سنبھال کر اس سین یا منظر کو فلم بند کرو..یہ کرو' میں اُس کی ماتمی ہائے اللہ جی ہائے اللہ جی سے تنگ آچکا تھا اس لیے غصے میں تھا..یہ عجیب واہیات اور لکڑ بگڑ قسم کا کراؤڈ تھا جسے میں اپنے ساتھ لے آیا تھا..میاں، خان سلیم، شاہد، حسن اور خالد ندیم سے سراسر مختلف مزاج کا کراؤڈ اور وہ بھی ایسا کہ اس کی ذہنی حالت بالکل مخدوش..

جب میں نے عمران سے ''یہ کرو' کہا تو وہ فوری طور پر اپنی ہائے اللہ جی کی گردان ترک کر کے سیدھا اور متحرک ہوگیا، اپنا ساز و سامان یوں آرگنائز کرنے لگا جیسے ورلڈ وار شروع ہونے کو ہو..اس عمران میں یہ عجیب کوالٹی تھی کہ وہ ابھی ایک لمحے نہایت لاپرواہ، بونگا اور بیہودہ ہو جاتا تھا اور دوسرے لمحے اتنا پروفیشنل اور ٹو دی پوائنٹ ہو جاتا تھا کہ طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیتا تھا آپ کو پہچاننے سے انکاری ہو جاتا تھا اور صرف اپنے کام کو پہچانتا تھا اسی سے غرض رکھتا تھا..

میں نے اپنی ٹی شرٹ کو توند پر کھینچ کر برابر کرنے کی کوشش کی، نیلی جین کو کانوں سے پکڑ کر اونچا کیا اور کیمرے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا ہیرو بن کر..اپنے ناکافی بالوں کو کافی سے زیادہ ماتھے پر بکھیر کر ایک خزاں رسیدہ پیلے دانتوں والی مسکراہٹ بکھیر کر کہا'' عمران..کیمرہ آن کرو..میں اب بیان کروں گا کہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر..جب آتش نسبتاً جوان تھا اس فنتوری میں داخل ہوا تھا تو اسے پہلی بار اپنے سامنے پا کر اس کی کیا حالت ہوئی تھی..یعنی کیا حالت غیر ہوئی تھی..''

عمران نے کیمرے کے ویو فائنڈر پر جھکے ہوئے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سر اُٹھا کر نہایت بے رخی سے بولا'' تارڑ صاحب پلیز آپ اس منظر کو برباد نہ کریں..منظر کو ہلاک نہ کریں..پلیز نکل جائیں یہاں سے..میں صرف نانگا پربت کو شوٹ کرنا چاہتا ہوں جس پر سے بادل ہٹتے جا رہے ہیں، آپ کو اس منظر میں شامل کر کے میں ویورز کو ہنسانا نہیں چاہتا..پلیز..''

میرا دل اور میری انا دونوں پاش پاش ہو گئے..کہاں وہ دن تھے کہ ہماری موجودگی منظر کو بناتی تھی اور کہاں یہ دن کہ ہم منظر کو بگاڑتے تھے..اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے عزت دیتا ہے اور

پھر اس قسم کی ذلت کہ عمران جیسے ہماشما بھی بے عزت کر دیتے ہیں..

لیکن وہ درست کہتا تھا..

کہیں بلند پہاڑوں میں قدرت کا جو سحر انگیز حسن ہوتا ہے اس میں ایک انسان بے حد فالتو اور بے وجہ ہوتا ہے..اور اگر وہ انسان مجھ جیسا بے ڈول اور عمر رسیدہ ہو تو وہ ریشم میں ٹاٹ کا ایک ایسا پیوند ہوگا جسے وہاں نہیں ہونا چاہیے..اس لیے میں منظر سے ہٹ گیا..

نانگا پربت..شل مکھی..سو چہروں والی برف پوش چوٹی..اس کے ہر چہرے پر سے گھنے بادل دھیرے دھیرے سرکتے جاتے تھے..وہ عیاں ہوتا جاتا تھا..اس کی سرد برہنگی کے آگے جو حجاب تھے وہ اٹھتے جاتے تھے..وہ ایک ایسی زرد شہزادی تھی جس کے ریشم و اطلس کے لبادے اترتے جاتے تھے اور اس کا گورا بدن اور سنہری ابھار اور اس کا سرو قد ظاہر ہوتا جاتا تھا..وہ مکمل سپردگی کے انداز میں اپنے آپ کو کھولتی تھی..برہنہ ہو کر لیٹتی وہ دیوں گھنے بادلوں کی اوٹ میں سے ظاہر ہو کر فنتوری پر اُمڈی آتی تھی۔ کسی ایک جنم میں اس سے بڑھ کر کوئی اور خوش بختی نہ تھی..

اور اس کا کمال یہ تھا کہ اس مکمل سپردگی اور سفید عریانی میں بھی چپ تھی..اس کے لبوں سے کوئی ''آہ'' کوئی ''ہائے'' نہ نکلتی تھی..

اگرچہ وہاں پانی نہ تھے..فنتوری میں سر سراہٹوں کی آبی اور سرد آہٹیں نہ تھیں اور نہ ہی گلابوں کے جھنگھٹے تھے لیکن وہاں اب نانگا پربت تو تھی..

جو دنیا بھر میں کہیں اور نہ تھی..

وہ شل مکھی تھی..

اس کے سو چہرے تھے..اور ہر برف چہرے پر سے نقاب اٹھتا جا رہا تھا....آہستہ آہستہ! کسی ایک جنم میں اس سے بڑھ کر کوئی اور خوش بختی نہ تھی....

''فیری میڈو مجھ سے شکائت کرتا ہے..
مجھے کیوں بیان کر دیا..تارڑ پتھر 92ء''

کہاں وہ دن کہ پروائے ننگ و نام نہ تھی.. یعنی آپ فیری میڈو میں اگر آپ کا جی چاہے تو باقاعدہ برہنہ گھوم سکتے تھے اور کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ تھا.. زیادہ سے زیادہ ایک آدھ بھیڑ رومینٹک ہو کر آپ کو سونگھ سکتی تھی.. تھامس، مشائلہ، جیرلڈ اور مطیع کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا..

پہلی بار جتنے دن یہاں ٹھہرا کوئی ایک سیاح بھی اس کے پھاٹک میں سے اندر داخل نہ ہوا..

فیری میڈو کے کناروں پر چند جھونپڑے تھے، چند بھیڑیں تھیں، کچھ بچے تھے.. صرف آٹھ برس پیشتر تک بھی ہم اپنے اپنے پائن پیلس میں جا کر استراحت فرماتے تھے اور اطمینان سے بیٹھتے تھے کہ کوئی دیکھنے والا نہ تھا..

ہم اس کے جنگل میں سنڈریلا کی مانند تنہا اور سحر زدہ گھومتے تھے.. سٹرابیری کا پہلا سفید پھول کھلتا.. تو ہمارے لیے..

سرد ہواؤں کی ایک سرگوشی تیرتی تو صرف ہمارے کانوں کے لیے..

کہاں وہ دن تھے.. اور کہاں یہ دن تھے کہ فیری میڈو کی جادوئی چراگاہ کا نصف حصہ چوبی مکانوں سے ڈھک چکا تھا.. بھیڑوں سے زیادہ تعداد میں مقامی اور غیر ملکی سیاح تھے جو منہ اٹھائے گھومتے تھے.. میلہ لگا ہوا تھا..

جھیل سیف الملوک کی مانند فیری میڈو بھی طوائف کا وہ کوٹھا ہو چکا تھا جہاں ہر کوئی آ سکتا تھا..

وہاں جہاں کھیت خنکی میں سرد اور سبز ہوتے تھے، چند بھیڑیں آوارہ ہوا کرتی تھیں.. شکور کی واحد گائے چرتی تھی، جہاں صرف ایک الاؤ روشن ہوتا تھا تو آسمان کے ستارے اوجھل ہو جاتے تھے اور اسے بجھانے سے وہ نزدیک آ جاتے تھے اور ہم پر برسنے لگتے تھے وہاں اب حرص اور ہوس کے ہوٹل.. فحش رونقیں تھیں..

اٹھارہ برس پیشتر جو فیری میڈو چند روز کے لیے میری جائیداد تھا.. میری ملکیت میں آ گیا تھا اب میں اسی فیری میڈو میں ایک اور.. سینکڑوں سیاحوں میں.. ایک اور ناآشنا سیاح تھا..

البتہ ایک فرق ضرور تھا..

فیری میڈو مجھے پہچانتا تھا.. اس کی گھاس کا ہر تنکا میرے جوگرز کے بوجھ کو پہچانتا تھا۔ اس کے گدلے گھاس بھرے تالاب کے پانیوں کا ہر قطرہ مجھے کہتا تھا کہ تم نے کبھی ہم پر.. کبھی سورج کے غروب میں اور کبھی اس کے اُبھرنے کے سمے کبھی ہم پر جھک کر نانگا پربت کی برفوں کو عکس ہوتے دیکھا تھا.. سویری ٹھنڈک میں جب زرد کرنیں ٹھنڈک میں گھل کر آتی تھیں اور ڈوبتے سورج میں ٹھٹھرتی شام کو بھی تم مجھ پر جھکتے تھے.. اس کے جنگل سے بھی صدائیں آتی تھیں کہ تم بھی میرے کنوارپن میں ملے تھے.. میرے پہلے محبوب تھے..

فیری میڈو میں پہچان بھی تھی اور شکائت بھی!

تمہیں کیا ضرورت تھی کہ اتنا عرصہ پہلے میرے کنوارپن میں اُتر کر میرا روپ دیکھ کر.. پیچھے جا کر.. ایک سفلی اور ریاکار دنیا میں میرے بدن اور حسن کو بیان کرتے.. کیا حاجت تھی میرا چرچا کرنے کی.. کتابوں کے صفحے سیاہ کرنے کی.. چپ کیوں نہیں رہے بیان کیوں کیا.. نہ بیان کرتے تو میں یوں رسوا نہ ہوتا.. پامال اور مجروح نہ ہوتا.. تم شیخی خورے تھے رہ نہ سکے.. شور مچا دیا.. اپنی انا کے تکبر میں کہ لوگو تم نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے.. اور لوگ مجھے دیکھنے آئے اور ان کے لیے ہوٹل اور خیمہ گاہیں بنیں.. اور اب مجھے دیکھ کر لوگ مسلسل مجھے روندرہے ہیں.. مجھے مسل رہے ہیں اور مجھ سے میرا کنوارپن چھن گیا ہے، بس یہی شکائت ہے تم سے کہ تم چپ کیوں نہ رہے.. بیان کیوں کر دیا!..

صرف رحمت نبی اور عزیز کی کیمپنگ سائٹ تھی جس نے فیری میڈو کے زوال پذیر حسن کو زیادہ مجروح نہیں کیا تھا.. وہ کسی حد تک اس کے قدرتی ماحول میں رچی بسی تھی..

ہم وہیں ٹھہرے..

اوپر کہیں.فیری میڈو کی بلند ترین ڈھلوان پر..نانگا پربت کے سوچہروں کے سامنے.. اگرچہ وہاں سرد ہوائیں سنسناتی تھیں میں نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا..اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں وہاں جا کر اپنا خیمہ لگاتا..

اس لیے میں بھی یہیں ٹھہرا..آرام طلب آسائش پسند ہر سیاح کی مانند رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں ہی ٹھہرا..

رائے کوٹ گلیشیر کے عین اوپر..نانگا پربت کا سامنا کرتے ہوئے جو گھاس کا میدان تھا وہاں خیموں کے طرح طرح کے رنگ تھے..خوش رنگ پرندے سمٹے بیٹھے تھے..ایک جانب ڈھلوان کی اوٹ میں ایک فیری میڈو سے حاصل کردہ مردہ لکڑی سے تعمیر شدہ ایک دیدہ زیب ڈائننگ ہال تھا اور خیمہ گاہ پر جھانکتی ڈھلوان پر دو تین خوش نظر کیبن تھے..

ان میں ایک کیبن ابھی تک ان چھوا تھا..

اس میں ابھی تک کسی نے قیام نہیں کیا تھا..

اس لیے کہ رحمت نبی نے وہ کیبن میرے لیے سنبھال رکھا تھا کہ تارڑ آئے گا تو وہ اس میں پہلا شخص ہوگا جو رات گزارے گا اور تب اس کیبن کی پیشانی پر ''تارڑ کیبن'' کی تختی آویزاں کردی جائے گی..یہ میرے لیے شمال کی محبت کا ایک انداز تھا..کیبن کے اندر تازہ دیار کی مہک تھی..ابھی ابھی رندے سے تراشی ہوئی لکڑی کی قدرتی خوشبو تھی..

آسائش کتنی آسانی سے انسان کو گمراہ کردیتی ہے..سادہ اور قدرتی زندگی کے عقیدے کو کیسے پاش پاش کردیتی ہے اس کا احساس مجھے اس کیبن کے اندر داخل ہوکر..اس کے وسیع بیڈ پر لیٹ کر ہوا..میں فوری طور پر خیمے کے اندر قیام کرنے کے رومان کو بھول گیا..اب اگر مجھے پیشکش بھی ہوتی کہ تم اٹھارہ برس پیشتر کے اس بلند مقام پر نانگا پربت کے روبرو خیمہ نصب کرسکتے ہو..تو میں نہ کرتا..

اس کیبن کی آسائش نے مجھے گمراہ کردیا تھا..

کیبن سے خیمہ گاہ دیکھی جا سکتی تھی..اس کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر براجمان ہوکر نیچے پھیلے خیموں اور ان میں سے ظاہر ہوتی اور گم ہوتی مخلوق پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی تھی..لیکن یہ نظر زیادہ دیر خیمہ گاہ پر نہیں رکتی تھی کہ اسے بھٹکانے کے لیے سامنے نانگا پربت کا سفید محل تھا..

میں نے دیکھا کہ گرد آمیز کیمپنگ سائٹ کے کنارے پر..رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر..اپنے بیش قیمت کیمرے کو سٹینڈ پر جمائے اس کے ویو فائنڈر میں اپنی داڑھی سمیت گھسا تصویریں اتارنے میں مگن تھا اور گدا اُس کے لیے چائے کی ایک پیالی تھامے ایک خادم کی طرح کھڑا تھا..

خان سلیم اپنے خیمے میں سے سر نکالے اپنی بے دریغ مونچھیں سنوارتا تھا..شاید اپنی متعدد نور جہانوں کی یاد میں ایک آدھ آہ بھر کر نانگا پربت کو تکتا تھا..

میاں فرزند رات کے کھانے کی تیاریوں میں مشغول تھا..

اور شاہد چند جرمن یا فرانسیسی سیاحوں پر اپنی انگریزی آزما رہا تھا اور وہ آزمائش میں تھے..

حسن کے چہرے پر نانگا پربت کو دیکھتے ہوئے ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی تھی اور اس میں اس کی بیگم کھیلتی تھی..

عمران اینڈ کمپنی فیری میڈو کے جنگل میں پوشیدہ ہوکر شاید کچھ دھواں اڑا چکے تھے اس لیے وہ تھکاوٹ اور پژمردگی سے یکسر ناآشنا تھے..اور فلم بندی میں جتے ہوئے تھے..

لیکن یہاں ایک اور کردار بھی تھا جس نے رائے کوٹ پل پر ہمیں جائن کیا تھا..لاہور سے ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا اگرچہ لاہور کا تھا اور یہ ندیم تھا..

جو پچھلی شب تاتو کی بارش میں بھیگتا پیاز چھیلتا تھا..

یہ ندیم کیا تھا؟..ہم سب کا دیرینہ دوست اور کوہ نوردی کا ساتھی..جو شمال کی الفت میں اسیر لاہور ایسے شہر بے مثال کو ترک کر کے..یہاں تک کہ اپنے بال بچوں کو ترک کر کے پچھلے تین برسوں سے گلگت میں مقیم تھا..بینکر تھا..گلگت میں پوسٹنگ کروا چکا تھا اور ہمیں ملنے کو..ہم میں شامل ہونے کی خاطر رائے کوٹ پل پر ہم سے آملا تھا..

یہ ندیم حسب معمول ایک گمشدہ اونٹ کی مانند ادھر اُدھر منہ اٹھائے پھرتا تھا اور اس اونٹ کی کوئی بھی کل سیدھی نہ تھی..سوائے دوستی اور معصومیت کی کل کے..جو بالکل سیدھی تھی..

وہ حسب عادت اپنے سامان کی پوٹلی ایک بڑھیا کی طرح سر پر اٹھائے ہوئے میری کیبن میں آ گیا تھا. ''سر جی..پلیز میں فرش پر سو جاؤں گا..آپ جانتے ہیں کہ خیمے کے اندر میرا دم گھٹتا ہے..''یاک سرائے'' کے سفر کے دوران میں نے بچن ٹینٹ میں بسیرا کیا کہ وہ کھلا اور ہوا دار تھا اور کے ٹو کہانی سے میں اسی لیے خارج ہو گیا تھا کہ تھکن سے واپس چلا گیا تھا..تو اجازت ہے..پلیز میں فرش پر سو جاؤں گا..''

اس چوبی کیبن کی کھڑکی میں.. نانگا پربت پوری کی پوری.. اپنی برہنہ برفوں اور جادوئی داستانوں سمیت.. ایک تصویر تھی.. کھڑکی کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی تھی.. فجر کی نماز پڑھتے ہوئے سلام پھیریے تو وہ یوں نظر آتی تھی کہ کافر بھی اس لمحے ایمان لے آتا تھا..

رحمت نبی اپنی مارگریتا کے تحفہ کردہ پروں والے آسٹرین ہیٹ میں.. اور عزیز اپنے ہاروں اور منکوں کے بہروپ میں.. ہمارے دوست بھی تھے اور میزبان بھی.. ندیم نہ چاہتے ہوئے بھی میرا کیبن میٹ تھا.. اگرچہ فرش پر سوتا تھا اور ایک ناآسودہ اونٹ کی مانند خراٹے لیتا تھا..

کیبن سے اُتریے تو رائے کوٹ گلیشیئر کی قربت میں ایک نہایت مختصر کھلونا سا ٹائلٹ تھا.. یہاں اب جتنی رونق اور گہما گہمی تھی اس میں پائی چیس جانے کی گنجائش نہ تھی.. یہ عین ممکن تھا کہ آپ جنگل میں فارغ ہو رہے ہوں اور یکدم سیاحوں کا ایک غول آپ کے سر پر آن کھڑا ہو کہ اوئے یہ کیا ہو رہا ہے..

چنانچہ کھلونا ٹائلٹ ایک مجبوری تھی..

اور میں ہمیشہ وہاں دیر کر دیتا تھا..

یہ نہیں کہ مجھے قبض وغیرہ کا کوئی مسئلہ تھا.. کوئی پائلز پرابلم تھی.. صرف اس لیے دیر ہو جاتی تھی کہ اس کھلونا ٹائلٹ کیبن میں ایک نہایت مختصر سا روزن تھا.. ایک دو چار انچ کی ایک تکونی کھڑکی تھی اور ایسی تھی کہ استراحت فرماتے ہوئے اس میں نانگا پربت جڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور میں اسے دیکھتا دیکھتا اکثر غافل ہو جاتا تھا کہ میں یہاں کس فراغت بھرے مقصد کے لیے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں.. میں اس تکونی کھڑکی میں سے دکھتی برفوں کو تکتے تکتے ایسا غافل ہو جاتا تھا..

کیمپنگ کے ڈائننگ روم کی اوٹ میں وہ بڑا پتھر تھا جس پر نو برس پیشتر عینی نے ''تارڑ.. 92ء'' پینٹ کیا تھا..

رحمت نبی نے اس پتھر کو فیری میڈو کی ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھا تھا اور ابھی حال ہی میں اسے صاف کر کے.. دوبارہ پینٹ کر کے بحال کر دیا تھا.. تاکہ سند رہے..

فیری میڈو ایک ایسا محبوب تھا جو کبھی فقط میرا تھا.. وفا شعار تھا.. اب اگر بے وفا ہو گیا تھا تو اس کا قصور نہ تھا.. اس کے حُسن کا چرچا کرنے والے اور بیان کر دینے والے کا دوش تھا..

پہلے پہل تو یہاں چند لوگ ہی پہنچے.. جو میری کتابیں پڑھ کر پہنچے.. اور پھر اس کا تذکرہ سیاحتی اداروں کے کتابچوں میں آ گیا.. ٹور آپریٹرز باقاعدہ ٹورز کا بندوبست کرنے لگے.. تب یہ

خاص و عام ہوا..

ان تمام قباحتوں کے باوجود.. حرص اور ہوس کے پھندوں کے باوجود.. گہما گہمی.. ہجوم اور بیہودہ رونق اپنی جگہ..... فیری میڈو میں اب بھی وہ سحر تھا جو جکڑ لیتا تھا.. آپ چاہیں تو اس ہجومِ ناروا میں تنہا بھی ہو سکتے ہیں.. اس میں اب بھی کشش ایسی تھی کہ.. اور وہ کہتی تھی کہ.. فردوس گر بر روئے زمیں است.. ہمیں است و ہمیں است.. و ہمیں است..

طوائف بن جانے کے باوجود اس کی دل کشی زاہدوں کے ایمان ڈگمگاتی تھی.. ہم نے فیری میڈو میں تین راتیں گزاریں..

''چھوٹا فیری میڈو بھی گمشدہ''

رحمت نبی کی کیمپنگ کے سوا اور بھی دکھ تھے.. اور بھی کیمپنگ سائٹس تھیں..

وہاں بھی.. جہاں میں نے اپنے خاندان کے ساتھ جنگل کے پہلے گھنے درختوں کے سائے میں خیمے لگائے تھے..

اور وہاں بھی..

جہاں میں ایک شام بھٹکتا ہوا.. جنگل میں گمشدہ جا نکلا تھا.. اور جنگل کی نیم سیاہی میں سے نکلتا ہوں تو سامنے ایک اور سرد برف آلود سحر انگیز منظر ہے.. ایک اور فیری میڈو ہے..

ہاں.. فیری میڈو سے پرے اس کے گھنے قدیم جنگل میں چھپا ہوا ایک اور مختصر فیری میڈو تھا.. جہاں دلدل تھی.. گھاس اور پانی تھے اور اُن میں وہی نانگا پربت عکس ہوتی تھی..

مجھے یاد ہے کہ اس فیری میڈو میں مجھے ڈر آیا تھا..

یہاں اتنا تنہا اور چھپا ہوا تھا.. اور اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں تشویش ہوتی تھی کہ کہیں میں یہیں نہ رہ جاؤں.. یہاں تو کوئی بھی نہیں..

وہاں پہنچ کر میں نے سوچا تھا.. کہ میں جو اب تک شمال میں درجنوں گھر تعمیر کر چکا ہوں.. خوش نظر کوہستانی بلندیوں پر آماجگاہیں بنا چکا ہوں.. لکڑی کے کئی کیبن میری ملکیت میں ہیں.. کبھی وادیٔ نلتر میں.. اور کبھی جھیل کرومبر کے کنارے.. اور کبھی کسی اشکوئے میں تو بس ایک اور کیبن اس پوشیدہ سب کی نظروں سے اوجھل چھوٹے فیری میڈو میں بھی بناؤں گا جہاں سے نانگا پربت بڑے فیری میڈو سے بھی کہیں بڑھ کر طلسم خیز اور حواس کے لیے باختگی کے کئی سامان پیدا کرتی ہے.. اور میں یہ کیبن جنگل میں گرے پڑے بھوج پتر کے درختوں سے اپنے ہاتھوں سے

تعمیر کروں گا.. اور جتنی دیر میں وہاں بیٹھا رہا اتنی دیر میں میں نے وہ کیبن تعمیر کر ڈالا اور اس میں ایک شب بھی گزاری.. لیکن ایک خیال جو کبھی اس سے پیشتر دیگر مقامات پر گھر اور کیبن تعمیر کرتے ہوئے میرے دل میں نہ آیا تھا.. اب آیا.. کہ یہاں صرف ایک کیبن کی تعمیر بھی اُس منظر کو جسے ابھی ابھی خالق نے تخلیق کیا ہے.. اُس کا سانس ابھی تک اس کے بوٹے بوٹے پتے پتے میں موجود ہے.. وہ خود موجود ہے.. تو یہاں ایک کیبن بھی اس کی شان میں گستاخی ہوگی.. جیسے کسی عبادت گاہ میں ایک دیوانہ داخل ہو کر اس کی پاکیزگی میں ایک قہقہہ لگا دے..

اور اب میں اس چھوٹے فیری میڈو میں داخل ہوتا ہوں تو اُس کی ڈھلوان پر متعدد کمرے اور چوبی رہائش گاہیں منہ کھولے کھڑی ہیں.. اور سیاح ہیں جو ان میں قیام کرتے ہیں اور اس ہوٹل کا بارلیش اور سیانا مالک فوری طور پر میرے لیے چائے بناتا ہے.. ڈھلوان کے قریب کراچی سے آئے ہوئے چند نوجوان خیمے لگائے غل کرتے ہیں اور رات کے الاؤ کے لیے لکڑیاں جمع کرتے ہیں..

بے شک یہ کیبن نہایت دیدہ زیب ہیں اور ماحول کے مطابق ہیں لیکن اس کے باوجود یہ وہ قہقہے ہیں جو نانگا پربت کی ہزاروں برس کی خلوت میں مخل ہوتے ہیں..

اگر میں بھی تاتو کا رہنے والا ہوتا اور چھوٹے فیری میڈو کا یہ علاقہ میری ملکیت میں ہوتا تو میں بھی اس کی ابدی تنہائی کی چنداں پرواہ نہ کرتا اور ایک بہتر زندگی کے لیے اور آسائش کے لیے.. سیاحوں کے لیے بغیر سوچے سمجھے یہاں ہوٹل بنا دیتا.. میں بھی ایسا ہی کرتا کہ روئی دنیا کے سب سے خوبصورت منظر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے تو میں کون ہوتا تھا اعتراض کرنے والا.. کل کلاں اگر نانگا پربت کے بیس کیمپ میں میکڈانلڈ کھل جاتا ہے اور اس کی ایک چوٹی پر ایک نیون سائن آویزاں کر دیا جاتا ہے جس پر میکڈانلڈ کا ایک مسخرہ آپ کو آنکھیں مارتا برگر کھانے کی تلقین کرتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا.. اس ہوٹل میں ایک خاصیت تھی کہ یہاں جتنے بھی کارکن اور ویٹر تھے وہ سب کے سب نہایت متشرع تھے اور صاحب ریش تھے.. تو کیا یہ غیر ملکیوں کی بے راہ روی کو برداشت کر پائیں گے.. لیکن پیسہ مذہب کو ہمیشہ زیر کر لیتا ہے..

فیری میڈو سے رخصت ہونے کے چند روز بعد یہاں ایک واقعہ ایسا ہوا جس کی بازگشت دنیا بھر میں سُنی گئی.. نانگا پربت کے بیس کیمپ تک جاتے ہوئے گنالو گلیشیر کو عبور کرتے ہوئے اس کی بھول بھلیوں میں کہیں ایک متشرع پورٹر نے ایک جرمن سیاح خاتون کو بے آبرو

کر دیا.. چونکہ وہ اس کا سہارا لیے گلیشیئر کے پار جا رہی تھی اور پھنس رہی تھی اس لیے پورٹر نے اسے ایک آسان شکار سمجھا.. اس واقعے نے پورے فیری میڈو کو بے آبرو کر دیا.. اس پورٹر کا تعلق رحمت نبی کے گروپ سے تھا یا متشرع حضرات سے.. اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن باہر کی دنیا میں فیری میڈو اتنا فیری نہ رہا.. کہا جاتا ہے کہ مجرم کو مقامی جرگے نے سخت سزا دی اور اس کی جائیداد ضبط کر لی.. لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے.. چند روز پیشتر سوئٹزر لینڈ کے اعزازی کونسل سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے دور سے ہی نعرہ لگایا.. تارڑ صاحب کہیں آپ ہی تو وہ پورٹر نہیں تھے.. ایسا نہ کیا کیجیے..''

یہ درست ہے کہ مغربی خواتین قدرے فراخ دل واقع ہوتی ہیں.. ہر ایک سے خلق کھیلتی اور فری ہوتی ہیں اور ایک ان پڑھ کوہستانی تو کیا ایک پاکستانی شہری بابو بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ ''گیم'' ہیں.. اور بعض اوقات وہ ہوتی ہیں' لیکن ان کا خاصا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی فراخ دلی اپنی من مرضی سے کرتی ہیں.. جی میں آئے گا تو سب کچھ کر گزریں گی.. جی میں نہیں آئے گا تو دولت کے ڈھیر بھی ان کو مائل نہیں کر سکتے.. مجبور نہیں کر سکتے.. بہر حال فیری میڈو کے شفاف ماتھے پر یہ پہلا کلنک کا ٹیکا ہے..

چھوٹے فیری میڈو میں جو کیبن تھے اُن میں اور اس مقام کی الگ تھلگ تنہائی ایک خاندان کی رہائش کے لیے بے حد موزوں تھی..

رحمت نبی کی کیمپنگ ایک پارٹی تھی..

یہاں کی رہائش گاہیں ذرا پردہ پوش اور شریف تھیں..

میں نے بہت کوشش کی کہ میں اس لمحے کو دوبارہ جی سکوں جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں حسن اور تنہائی کے ڈر کے سوا کچھ نہ تھا.. لیکن نہ جی سکا.. کہ وہ لمحہ مر چکا تھا.. ان لکڑی کے کمروں کے نیچے کہیں دفن ہو چکا تھا..

''فیری میڈو کے جنگل کے جھرنوں اور درختوں کی سمفنی اور شام ہو رہی تھی''

میرا خیال ہے کہ میں نے بہت آہ و زاری کر لی.. بہت ماتم کر لیا.. اب آگے چلتے ہیں کیونکہ آج تک جتنا بھی ماتم کیا گیا ہے اس کے اثر سے جو کچھ کھو گیا ہے وہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہوا..

اب آگے چلتے ہیں..

میرے ساتھی اب تک بیال کیمپ پہنچ چکے ہوں گے.. اور میں چھوٹے فیری میڈو سے نکل کر برچ اور بھوج پتر کے جنگلوں میں بھٹک رہا تھا..

اور میں تنہا نہیں بھٹک رہا تھا.. میرے عقب میں بلڈ ہاؤنڈز تھے.. خون کے پیاسے کتے تھے.. ان کے کندھوں پر کیمرے تھے اور لائٹیں تھیں اور مائیک تھے اور وہ میرا پیچھا کر رہے تھے..

''عمران آخر تم کیا چاہتے ہو''

''سر جی'' اس نے اپنا ثقافتی عمل دوہرایا.. یعنی داڑھی کھجائی.. نیکر کو ٹٹولا اور پھر بولا.. ''آئیڈیا یہ ہے کہ باباجی.. یعنی آپ.. اس بے مثال تنہائی کے جنگل میں اداس اور مغموم اپنے کسی عشق خاص کے تصور میں بھٹک رہے ہیں.. کبھی اس درخت پر چڑھ کر نظارے دیکھتے ہیں اور کبھی اس درخت کے زمین بوس تنے کے نیچے سے گزر کر یکدم کیمرے کے سامنے آ جاتے ہیں.. اس تنے پر جمی ہوئی کائی کی دبیز تہہ کو الٹتے.. اس کائی کے اندر جو ایک گہری سبز ان چھوئی تنہائی ہے اسے دیکھتے.. قدرت کی نیرنگیوں سے حیران ہوتے.. پھر اس ندی کو ناپتے ہوئے پار جاتے ہیں.. اگر ناپتے ہوئے گر جاتے ہیں تو بے حد مناسب ہوگا.. چند خراشیں آئیں گی کمر کا ایک آدھ منکا ٹوٹ

جائے گا لیکن شاٹ بے مثال بنے گا.. تو اس ندی کو پھلانگ کر دوسری جانب جب اس سوکھے ہوئے ٹنڈ کے قریب آتے ہیں جو ایک تجریدی مجسمے کی صورت بانہیں پھیلائے کھڑا ہے تو آپ اس پر ہاتھ رکھ کر اپنا سانس درست کرتے ہیں اور پھر راکے پوش گلیشیر کی برفوں کو حیرت سے تکتے ہیں.. میں کیمرہ آپ کے جھریوں بھرے ہاتھ پر لاؤں گا اور یوں سوکھے ہوئے تنے کے پس منظر میں آپ کا ہاتھ بھی ایک خزاں رسیدہ شجر کی ٹہنی دکھائی دے گا.. سٹارٹ کیمرہ!"

عمران کیمرے پر ایک زرد ترپال چڑھائے.. اسے بارش یا ندی کے چھینٹوں سے بچانے کے لیے.. اپنا دھڑ کونا سر اس کے اندر گھسائے مجھے شوٹ کرنے لگا.. میں حسب ہدایت فیری میڈو کے ابھی تک ان چھوئے جنگل میں گم ہوا.. اس کی ابدی حیرتوں کو تکتا..

کبھی دھوپ میں آتا.. کبھی چھاؤں میں چلتا.. ندیاں پھلانگتا.. بمشکل پھلانگتا.. کہ تشہیر اور جعلی ناموری کے لیے پھلانگتا.. ایک بوسیدہ درخت کے عظیم اور خاموش پڑے تنے کے نیچے سے سر جھکا کر گزرا.. ایک اور زمین بوس تنے کے نیچے اتنی جگہ نہ تھی تو میں لیٹ کر اپنے آپ کو گھسیٹتا اور اس دوران ان شاخوں اور باریک پتھروں پر بدن کو اذیت دیتا نیچے سے آگے ہوا.. ایک اور پر پیچ اور سوکھے ہوئے شجر کے اوپر چڑھ کر خزاں رسیدہ پتوں کے ایک ڈھیر پر کودا اور اس آہ کو دبا کر جو عمر رسیدگی کا شاخسانہ تھی.. سیدھا کھڑا ہو گیا.. اپنا مختصر رک سیک سمیت..

"واہ تارڑ صاحب" عمران کا دھڑ کونا سر کیمرے کی غار میں سے باہر آ گیا "کیا بے دریغ چھلانگ لگائی ہے.. ایکشن فلموں کے ہیرو لگے ہو.. وین ڈیم لگے ہو.. چوٹ تو نہیں لگی.."

"نہیں جی.. معمولی بات ہے.." میں نے سینہ تان کر کہا.. اور اس "آہ" کو پھر سے دبایا جو پورے بدن میں آہ آہ کر رہی تھی..

"معمولی بات ہے تو پھر یہ شاٹ دوبارہ ہو گا.."

"کیا کہہ رہے ہو عمران.. ہائے!.." اب وہ آہ بے اختیار نکلی جسے میں اب تک دبائے ہوئے تھا..

"سر جی.. " ویری فرینکلی میرا نہیں تھا خیال کہ آپ اتنی پھرتی سے درختوں کے تنوں پر چڑھ کر وین ڈیم کی طرح چھلانگیں لگا لیں گے اس لیے میں کیمرے سے آپ کو فالو نہیں کر سکا.. پلیز ذرا دوبارہ کر لیں.. معمولی بات ہے.."

میں کبھی بھی فیری میڈو کے جنگل کو بیان نہیں کر پاؤں گا..

یہ میرے بس کی بات نہیں.. اس کے بیان کے لیے کوئی گارسیا مارکیز یا ٹالسٹائی درکار ہے جو میں نہیں ہوں.. اگرچہ میں ان دونوں سے برتر ہوں کہ میں فیری میڈو کے جنگل میں گم ہوا اور وہ اس کے وجود سے نا آشنا تھے.. ٹالسٹائی کے بارے میں تو ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ دنیا بھر میں صرف وہ ایک شخص ہے جو تکبر کر سکتا ہے.. یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں" ہوں..

میں جب بھی ان قدیم شجروں کے نیم تاریک بھید کے بھیتر میں گیا تو لفظ گم ہو گئے.. میں کورا کاغذ ہو گیا.. میں ان زمانوں میں چلا گیا جب حروف تہجی ایجاد نہیں ہوئے تھے.. بابل اور نینوا کی تختیوں کا وجود نہ تھا.. انسان کے اظہار کے لیے سوائے اس کے چہرے کے اور کچھ موجود نہ تھا.. میرا ذہن اور بدن ایک کاچنی سے پوتی ہوئی تختی ہو گئے جس پر کوئی پورے نہ تھے.. اور ذہن اور بدن کی اس پوچی ہوئی تختی کے گرد فیری میڈو کے جنگل کی نادیدہ بیلیں لپٹتی چلی گئیں.. سرسبز کائی میں سے زور لگا کر نکلنے والی برفانی ندیاں بہنے لگیں.. اور ان کے کناروں پر جو فرنز.. پانی کے بوٹے اور جھاڑیاں تھیں انہیں وہ تخلیقی ہوئی بہاؤ کے ترنگ میں آ گئیں..

چیڑ، بھوج پتر اور برچ اور جانے کیسے کیسے ان جانے شجر مجھ سے کلام کرنے لگے..

اس جنگل کی ان ہونی جھاڑیاں جن میں آسیب بھی تھے اور حسن بھی.. کائی زدہ پتھر اور سینکڑوں برسوں سے زمین پر گرنے والے پتوں کا فرش میرے جوگرز کے راستے سے میری رگوں میں اترنے لگا.. جو زمین تھی وہ ان بوسیدگی سے دو چار پتوں اور ٹہنیوں کے گدیلے وجود کے نیچے کہیں تھی.. ہزاروں برسوں سے گم ہو چکی تھی..

کوئی ایک ندی تھی جس کے کنارے ایک درویش ایک آوارہ گرد کا جھونپڑا ہو سکتا تھا؟.. ہر ندی ایسے ایسے جھرنوں.. کنجوں اور ہریاول کے گھنیرے جنگلوں میں سے گزرتی تھی کہ اس کا ہر مقام پوری حیاتی.. وہیں بسر کر دینے والا ہوتا تھا..

سورج کی روشنی جو جنگل کے گھنیرے وجود کے چھتنار میں سے راستے بناتی اترتی تھی تو چیڑ اور بھوج پتر کی شاخوں میں سے.. ان سے لگتی بیلوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتی نیچے خزاں رسیدہ پتوں کے گدیلے فرش پر جب کہ میرے جوگر اس میں دھنستے تھے مجھ تک آتی تھی تو اتنی مدھم ہو جاتی تھی کہ ایک شام ہوتی تھی..

ایک شام..

ایسی شام جس میں اگرچہ سناٹے کی زبان بندی تھی.. ایک گہری چپ تھی.. خاموشی تھی

اس شام میں بس اگر آپ ذرا اپنے تمام تر حواس کو آواز دیں..غور سے کان لگا کر سنیں تو اس میں.. آج تک..آپ کی مختصر حیات میں..آپ پر جن دھنوں نے آپ کے دل پر اثر کیا تھا..وہ سب کی سب نہایت مدھم اور سرگوشیوں کی سُروں میں سنائی دیتی تھیں..ہزاروں وائلنوں کا ایک آرکسٹرا جیسی آوازوں میں..مدھم سُروں میں..ہر شاخ..ہر جھاڑی کو چھوتا..ان میں لرزش پیدا کرتا..ندیوں میں مدغم ہو کر ان کے دھیمے شور میں ہلا دستک دیتے شامل ہوتا..پھر کسی ایک ستار کی مدھ بھری سرگوشی.... کسی طبلے پر مدھم تھاپ جیسے اس پر ہتھیلی نہیں پر ندو اُترا ہوا تی نرماہٹ سے...ایک سارنگی جس کا گز فیری میڈو کے چیڑ کے بال تھے..یہاں وہ تمام چھوون..چاے کوکلی اور خورشید انور فضا میں تھے جنہوں نے کبھی آپ کے دل کی تاروں کو چھیڑا تھا..وہ تمام نغمے جو چھیلے دنوں میں آپ پر چھکے اور وہ تمام گیت جو اندھیاری شبوں میں دل میں تاریکی بھرتے تھے...سب یہاں موجود تھے..اور میں مبالغہ نہیں کر رہا..انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آیا ہوا ہر عجوبہ ہر عمارت کسی نہ کسی طور بیان ہو سکتی ہے..لیکن اس کے ہاتھوں سے ترتیب شدہ جو خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اس کا تخلیق کردہ کوئی بھی قدرتی منظر کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا..اگر وہ بیان ہو جائے تو وہ بھی بیان ہو جائے جس نے اسے بنایا ہے..اور وہ تو کبھی بیان نہیں ہوتا کبھی عیاں نہیں ہوتا..انسان بھی تحریر تصویر یا سُر میں جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ جتنا زیادہ بیان ہو سکے اتنا ہی کم تخلیقی ہوتا ہے اور جس قدر اس کے بیان میں دشواری ہو اس حساب سے وہ رب کے قریب پہنچ رہا ہوتا ہے تخلیق کے حوالے سے..اسی لیے فیری میڈو کے جنگل کے لیے لفظ صرف کم نہیں پڑتے بلکہ سراسر گم ہو جاتے ہیں..اور ان لفظوں کی تلاش اور اسے بیان کرنا محض ایک کار زیاں ہے..کبھی کوہ طور پر جلتی جھاڑی کے نور کو بھی لفظوں میں قید کیا جا سکتا ہے؟ کیا غار حرا میں جو تجلّی پھیلی تھی اسے بیان کیا جا سکتا ہے؟..یہ معجزے پیغمبروں کے لیے تھے' لیکن میرا یقین ہے کہ یہ معجزے کبھی منقطع نہیں ہوتے وہ جاری رہتے ہیں صرف ان کا روپ الگ ہو جاتا ہے..ان میں سے ایک فیری میڈو کا جنگل ہے جو ایک درویش ایک آوارہ گرد کے لیے بچا کر رکھا گیا تھا..جس کے سناٹوں اور تنہائی میں آپ پر وہ کچھ وارد ہوتا ہے جس کا اظہار آپ کو تختۂ دار پر لے جا سکتا ہے..اناالحق کا اعلان کرنے والے اسی قسم کے جنگلوں میں ہی گم ہوتے تھے اور جو کچھ ان پر وارد ہوا اس کا برملا اظہار کر دیا..اور دار پر کھینچے گئے..اس لیے میں بھی اظہار نہیں کرنا چاہتا..

''سر جی ہم کھڑے کھڑے سوکھ گئے ہیں اور آپ بت بنے کھڑے ہیں اتنی دیر سے''

کاظمی کھڑ کھڑا کر ہنسا ''ایکشن دیں ناں..''

عمران اینڈ کمپنی ایک ناممکن شے کے حصول میں جتے ہوئے تھے..وہ فیری میڈو کے جنگل کو کیمرے میں قید کرنا چاہتے تھے..اور وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کبھی نہیں کر سکتے..صرف میرا وجود تھا جس میں اس قدیم جنگل کی سمفنی بجتی تھی..اس کی راگنی دھڑکتی تھی..اس کے شجر اُگتے تھے..چشمے بہتے تھے..اس کی سینکڑوں برسوں کی تنہائی پھیلتی تھی صرف میرے وجود میں..اور عمران کا کیمرہ میرے وجود میں نہیں اتر سکتا تھا..

''سر جی'' عمران نے بھی احتجاج کیا..''یہیں شام ہو جائے گی..لائٹ چلی جائے گی..''

''سوری..''اور میں ناممکن کی جستجو میں چلا گیا..اس کی ہدایت کے مطابق جنگل میں اُترنے لگا..

یہاں کتنی شاہ گوریاں تھیں جن کے بدن کے نیل مدھم نہیں ہوتے تھے..کتنی زرد شہزادیاں تھیں جن کے لبادے اس کی ندیوں میں بھیگتے ان کے سنہری بدنوں کو عریاں کرتے تھے..

کیسی کیسی کرومبر جھیلیں تھیں جو حزن آمیزی میں کلام کرتی مہکتی تھیں..تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملے..

عجیب سنو لیکس تھیں جن پر یادوں کے بادبان کھلے تھے اور ان پر تتلیاں اڑتی تھیں..

یہاں کتنے اشولے..ہوشے..اپالی گان..اردوکس اور ترشنگ تھے..گجرات اور جھنگ تھے..سوہنیاں اور ہیریں تھیں..

کیسی کیسی جدائیاں تھیں..وصال تھے..جن کی سسکیوں میں کبھی اذیت تھی اور کبھی مسرتیں..

یہاں میری پوری زندگی تھی..

''سر جی..''عمران بہت ہی ناگوار ہو گیا''لائٹ کم ہو رہی ہے اور آپ چلتے چلتے رُک جاتے ہیں..تھک گئے ہیں''

''ہاں یار میں تھک گیا ہوں..اتنے برسوں سے اس جنگل کی آرزو میں چل رہا ہوں اور اس کے بھید دور ہوتے جاتے ہیں..میں ان تک پہنچ نہیں پا رہا..میں کبھی اس بشام کے موٹل میں سندھ کی سرمئی چادر میں لپٹا دیکھتا ہوں..کبھی برسین میں اس کی جھلک دیکھتا ہوں لیکن اس کو حاصل نہیں کر پاتا..میں اس میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرنا چاہتا ہوں..گنیس مندراں پاکے..

متھے تلک لگا کے..اور یہ جنگل ہے کہ..''

''سرجی..''

''میں واقعی تھک گیا ہوں عمران..ایک مدت چلتے چلتے تھک گیا ہوں..کیمرہ آف کرو..پیک اپ یار..''

''پیک اپ'' عمران نے اپنے بغل بچوں کو حکم دیا'' سرجی پتہ نہیں کہاں نکل گئے ہیں..''

''بیال کیمپ بھی برباد..لیکن نانگا پربت اب بھی حکمران تھی''

بیال کیمپ..

فیری میڈو کے جنگل سے اتر کر رائیکوٹ گلیشیئر کے کناروں پر جو ایک ونڈر لینڈ ہے..

جہاں سے نانگا پربت کا بیس کیمپ آپ کو بلاوے بھیجتا ہے کہ بس آ جاؤ..

جہاں نانگا پربت یوں سر پر اُمڈتی آتی ہے کہ آپ اپنے ہاتھ اوپر کر کے اسے روکنا چاہتے ہیں کہ کہیں اس کی برفیں گر کر آپ کو دفن نہ کر دیں..

جہاں سے اٹھارہ برس پیشتر میں اپنے جرمن دوستوں تھامس اور شائمہ کے ساتھ آ گیا تھا اور بیس کیمپ تک نہیں پہنچ سکا تھا اور واپسی پر ایک کھائی میں اٹک گیا تھا اور برفباری شروع ہو گئی تھی..

پھر ایک ندی کے کنارے میں نے میمونہ اور عینی کو چھوڑا تھا اور سلجوق، سمیر کے ہمراہ پورٹر شکور کی راہنمائی میں بالآخر بیس کیمپ تک پہنچ گیا تھا اور شام ڈھلے ہم گنا تو گلیشیئر کراس کر کے واپس بیال کیمپ کے قریب آ رہے تھے تو سلجوق پر بلندی کا اثر ہو گیا تھا اور پھر گئی رات ٹہنیوں اور شاخوں سے ساختہ شعلوں کی روشنی میں ہم فیری میڈو واپس پہنچے تھے جہاں میمونہ اور عینی رو رہی تھیں..انہیں بتایا گیا تھا کہ رات کی تاریکی میں بیس کیمپ سے واپس کم لوگ ہی آتے ہیں..

یہ وہی بیال کیمپ تھا..لیکن وہی نہ تھا..

اس کا کھلا منظر بھی ہوٹلوں اور چار دیواریوں میں بند کر دیا گیا تھا..نانگا پربت کا اُجلا داغ داغ ہو چکا تھا..اُس کے سفید چہرے پر کمرشل ازم کی چھائیاں اور کیل اور دھبے تھے..

شکل بھی نانگا پربت کے اس چہرے کا کھلا دیدار اب ممکن نہ تھا..پہلے لکڑی کی کیبنوں..

حد بندیوں.. پتھر دموں اور خیموں کو دیکھو اور ان کے پار نانگا پربت کی بے بس اداسی دیکھو..

جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا..

جہاں ہم بے دریغ چلتے تھے وہاں اب ذاتی جائیداد کی حد بندیاں تھیں جو کبھی کسی ندی کو کاٹتی تھیں اور کہیں گھاس بھری ڈھلوانوں کے بیچ میں ایستادہ نظر آتی تھیں.. آپ بیال کیمپ کے خوش نظر گھاس بھرے پیالے میں ندیوں کو ناپتے صرف نانگا پربت کو نظر میں رکھتے ہوئے اب نہیں چل سکتے تھے.. بلکہ ان حد بندیوں سے پرے ہو کر درختوں کے ساتھ ساتھ چل کر آگے جاتے تھے..

وہاں پریوں کی چراگاہ کے پرکٹ چکے تھے.. یہاں بیال کے بدن کے ٹکڑے ہو چکے تھے..

اگرچہ یہ طے ہے کہ جو کوہ نورد آج کے فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو دیکھتے ہیں اور وہ تصور نہیں کر سکتے کہ کنوارپن رخصت ہو چکا ہے.. وہ جب آج سے اٹھارہ برس بعد یہاں آئیں گے تو وہ بھی رنجیدہ ہوں گے کہ جب ہم پہلی بار یہاں آئے تھے تو یہاں محض چند کیبن تھے.. کچھ خیمے تھے اور آج میکڈانلڈ اور کے ایف سی کھل چکے ہیں..

ہر نسل کے مقدر میں ہے کہ وہ آج کے دیکھے ہوئے منظروں کا.. کل ماتم کرے.. کم از کم پاکستانی نسل کے مقدر میں یہی ہے کیونکہ یورپ میں تو ایسے منظر سینکڑوں برسوں تک جوں کے توں رکھے جاتے ہیں.. ایک ہم ہی ہیں جو اپنی صورت کو بگاڑ لیتے ہیں..

کچھ سنوار نہیں سکتے محض بگاڑ سکتے ہیں..

کچھ تخلیق نہیں کرتے ہاں تباہ کر سکتے ہیں..

ایک بار جب اُن زمانوں کے صدر پاکستان فاروق لغاری وادی اشکومن سے شروع ہونے والی ازبکستان روڈ کے بارے میں کچھ معلومات چاہتے تھے کہ میں انہی دنوں واکھان ہی کی قربت میں "پاک سرائے" کے ٹریک سے واپس آیا تھا تو میں نے ان کی خدمت میں ایک ہی درخواست پیش کی تھی کہ عوام کی خوشی کے بغیر اگر پورے پاکستان پر قبضہ کیا جا سکتا ہے تو براہ کرم حکومت صرف فیئری میڈو کے علاقے کو ہی اپنی تحویل میں لے لے.. اس پر قبضہ کر کے اسے جوں کا توں محفوظ کر لے.. لیکن اُن دنوں لغاری صاحب اور بی بی بے نظیر کے درمیان ڈوئل شروع ہو چکا تھا جس کے سامنے ایک جنگل.. کچھ گھاس اور ایک برف پوش پہاڑ کی کچھ حیثیت نہ تھی.. ویسے مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا.. اقتدار کے ایوانوں میں کوئی نہ کوئی آئے گا

جو فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو ان کا اصل روپ لوٹا دے گا..

میرے ساتھی کب کے بیال کیمپ پہنچ چکے تھے..

ہوٹل اور کیمپنگ کے کچن میں سے چائے پی چکے تھے.. بسکٹ کھا چکے تھے اور ایک سیاح گروپ جو یقیناً لاہور یا ملتان سے تعلق رکھتا تھا اس کی منت سماجت کر کے اُن سے دو آم حاصل کر کے انہیں نوش کر چکے تھے اور اب گھاس پر استراحت فرماتے میرا انتظار کر رہے تھے..

ان میں میاں فرزند اور شاہد کے چہرے مغموم تھے اور بجھے ہوئے تھے کہ وہ بھی گمشدہ بیال کیمپ کے سوگ میں تھے.. رنجیدہ اور چپ تھے.. وہ بھی میری طرح من ہی من میں گزر چکے بیال کیمپ کو یاد کرتے تھے..

البتہ گردآمیز پُرمسرت تھا اور اپنی سرخ پی کیپ اوڑھے یہاں سے نظر آتی بچی کچھی نانگا پربت کی بے تحاشا تصویریں بنا رہا تھا... اور گداگمہبانی کر رہا تھا کہیں سائیں کے کیمرے کے آگے سے کوئی گزر نہ جائے..

ندیم ابھی تک آم کی اس ایک پھانک کے تصور میں ہونٹ چاٹ رہا تھا جو اس کے حصے میں آئی تھی..

حسن اس منظر سے خوش تھا لیکن معصومیت سے شکایت کرتا تھا کہ سرجی اگر یہاں ہوٹل کھل سکتا تھا تو ایک پی سی او کیوں نہیں کھل سکتا تھا.. کم از کم میں اپنی بیگم سے ہی بات کر لیتا..

عمران اینڈ کمپنی بھی مستعد تھے اور نانگا پربت کو کیمرے کی قید میں لانے کے لیے زاویے بدلتے تھے..

اس سے آگے جانا ممکن نہ تھا.. شام ہونے کو تھی..

آگے ایک چٹان کی اوٹ میں ابھی تک ان چولہوں کی راکھ تھی.. پتھروں پر دھوئیں کی سیاہی تھی جہاں برسوں پہلے ہرمن بوہل کا بیس کیمپ قائم ہوا تھا اور اس نے نانگا پربت کو پہلی بار تسخیر کیا تھا.. اور اس چٹان سے آگے وہ بڑا پتھر تھا جہاں سے رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر معلق ایک راستہ شروع ہوتا تھا.. جس راستے سے میں اور قاسم اور مشاہد گزرے تھے.. پھر سلجوق اور سمیر کے ہمراہ اس راستے پر چند قدم رکھ کر لوٹ آئے تھے اور برچ کے جنگلوں میں گزر کر بیس کیمپ تک گئے تھے..

شام ہونے کو تھی..

میں ایک بار نہیں دو بار ان حیرت بھرے منظروں کو دیکھ چکا تھا لیکن انہیں سہ بار

دیکھنے کی ہوس تھی.. لیکن شام ہونے کو تھی..

ہوس کا کوئی انجام نہیں.. کوئی اختتام نہیں.. یہ ایک ندیدہ بچہ ہے جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا.. یہ ایک ایسا کتا ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے شکم میں اب کوئی گنجائش نہیں.. ہوس یہ سب کچھ ہے..

صوفی اور درویش ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ ہوس اور حرص کو تیاگ دو کہ اس میں سکون اور فلاح ہے.. لیکن وہ بھی تو اپنے مرشد اور رب کی ہوس اور حرص میں مبتلا ہوتے ہیں.. ابھی دیدار کرتے ہیں اور اس سے اگلے لمحے میں پھر سے اس کے چہرے کو دیکھنے کی ہوس میں بے چین ہو جاتے ہیں..

کوہ نورد بھی ان جیسے ہوتے ہیں.. ان کے مرشد بس ایسے ہی بیال کیمپ ہوتے ہیں ان کے خدا بھی شاہ گوریاں اور کرومبر جیسی جھیلیں ہوتی ہیں.. وہ انہیں دوبارہ دیکھنے کی ہوس میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں..

دراصل حرص اور ہوس ہی وہ جذبے ہیں جو انسان کو زندہ رکھتے ہیں.. یہ نہ ہوں تو وہ بے حد شانت ہو جائے.. مٹی کا ایک بے جان تودہ ہو جائے.. یوں عشق اور کوہ نوردی دو نگی بہنیں ہیں..

ان دونوں کا مزاج ایک ہے..

ان دونوں میں حرص اور ہوس مشترک ہے..

ابھی دیکھا اور اگلے لمحے پھر سے دیکھنے کی آرزو..

لیکن شام ہو رہی تھی.. یہاں ان بلندیوں پر حرص اور ہوس کے چراغ جلانے سے بھی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا..

ہمیں یہیں سے لوٹ جانا تھا..

میں نے لوٹنے سے پیشتر جو آخری نگاہ ڈالی تو کیمپوں.. خیموں اور حد بندیوں کے باوجود.. اوپر برج کے جو جنگل تھے اور نانگا پربت کی امڈتی ہوئی برفوں کا جو طلسم تھا وہ کم نہ ہوتا تھا.. دل کو اسیر کرتا تھا.. شام ان رکاوٹوں کو مدھم کرتی تھی اور قدرت کا بے پناہ طلسم ہر شے پر حاوی ہوتا تھا.. برفانی تودے اب بھی ایک گہری گونج کی دھمال میں نیچے اترتے تھے اور ان کیمپوں اور حد بندیوں کو مسمار کرتے چلے جاتے تھے..

شل کھی.. سو چہروں والی نانگا پربت اب بھی حکمران تھی.. وہ برف کی ملکہ تھی.. اور اب بھی وہ انسانی ہاتھوں کی بدشکلی کو معدوم کر دینے پر قادر تھی.. لیکن کب تک..

''الاؤ بجھا تو نانگا پربت کے برف مینڈک، سانپ' محلات اور ملکائیں فیری میڈو میں اُترنے لگے''

الاؤ روشن تھا..

آگ بھڑکتی تھی..

سُلگتی سرخ دہکتی لکڑیوں میں سے شراروں کے دہکتے چھینٹے اڑتے تھے جنہیں تاریکی دبوچ کر بجھا دیتی تھی..

الاؤ کے گرد ایک ہجوم تھا جو آگ کی قربت کا دمکتا اور سُرخ ایک ہی چہرہ لیے ہوئے تھا..

سب الاؤ کے پُرفریب آتشی طلسم میں اسیر اسے گھورتے تھے.. اور صرف میں تھا جو کبھی کبھار اوپر دیکھتا تھا.. اوپر فیری میڈو کا آسمان تھا اور ستاروں سے خالی تھا..

پٹرول کے خالی کنستروں پر تھاپ پڑتی تھی تو الاؤ کی آگ بھی اس کی دھمک سے دھمک اٹھتی تھی..

رحمت نبی کا بیٹا لکڑیوں سے اپنے ننگے پاؤں بچاتا.. اپنے پُرشوق اور سُرخ چہرے پر الاؤ کی سُرخی مزید سجاتا ایک کوہستانی مستی میں مست ناچتا تھا..

اس سنگنگ پارٹی میں.. مکمل طور پر مردانہ ہجوم میں صرف ایک جرمن سیّاح خاتون تھی جو دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہی تھی.. اور عزیز اس کا خاص خیال رکھتا تھا.. اگرچہ وہ خاص خیال رکھنے کی عمر سے آگے جا چکی تھی..

تاریکی میں شور بہت تھا..

کچھ موسیقی کا.. کچھ گیت سنگیت کا..

ذرا فاصلے پر ایک ڈچ اور فرانسیسی گروپ کے خیمے تاریکی میں روپوش تھے اور ان میں روپوش سیاح سونے کی سعی کرتے تھے اور کبھی کبھار ان میں سے کوئی ایک خیمے کے پردے میں سے منہ نکال کر اپنی زبان میں احتجاج کرتا تھا کہ ہم سونا چاہتے ہیں.. یہ ہلا گلا موقوف کیا جائے..

یہ سیاح بہت دور سے آئے تھے.. ایک زر کثیر خرچ کر کے آئے تھے اور اب ایک فائیو سٹار ہوٹل کی آسائش اور سکون کے متمنی تھے.. جو انہیں نہیں مل رہا تھا..

باہر اُودھم مچا تھا..

مقامی لوگ نہایت تہذیب یافتہ تھے اور شور مچا رہے تھے..

ایک الاؤ کے گرد ناچتے تھے..

پھر وہ فیری میڈو کیا جہاں راتوں میں کم از کم ایک الاؤ روشن نہ ہوتا ہو..

یہ وہ سیاح نہیں جانتے تھے.. صرف میں جانتا تھا جس نے اٹھارہ برس پیشتر یہاں ایک الاؤ روشن کیا تھا..

یہاں نہیں.. وہاں اس پتھر سے اوپر جہاں '' تارڑ.... 92ء'' نقش تھا اور جسے مقامی لوگ تارڑ پتھر کے نام سے پکارتے تھے.. اس سے اوپر بلندی پر کبھی میرا خیمہ تھا.. اور وہیں میں نے اور گیراؤ نے اپنی آخری شب میں.. اس عظیم برفانی وسعت کی گود میں جب یہاں اور کوئی نہ تھا ایک الاؤ روشن کیا تھا.. اور کیا یہ حیرت در حیرت نہیں ہے کہ آج سویرے جب میں اوپر اس بلندی تک گیا تھا جہاں میں نے ان زمانوں میں اپنا خیمہ نصب کیا تھا تو وہاں جو گھاس تھی وہ اب تک دبی ہوئی لگتی تھی.. یقیناً ایسا ممکن تو نہیں' لیکن ایسا لگتا تھا.. گھاس ایک بار چاہت سے دب جائے تو برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی اسی بوجھ سے دبی ہوئی لگتی ہے.. لیکن اصل حیرت اس حقیقت میں تھی کہ اُس مقام کی قربت میں جہاں ایک تنے کی اوٹ میں ہم نے الاؤ روشن کیا تھا.. اس کے آثار.. جلی ہوئی لکڑیوں اور ایک نیم سوختہ تنے کی صورت میں ابھی تک موجود تھے.. یہ عین ممکن ہے کہ ہمارے بعد بھی اسی جگہ پر آوارہ گردوں نے الاؤ جلائے ہوں اور یہ اُن کے آثار ہوں.. لیکن میں اُس نیم سوختہ تنے کو پہچانتا تھا.. یہ وہی تھا.. جس کے بجھنے سے فیری میڈو کے آسمان پر ٹمٹماتے تارے ہم پر اُترے تھے..

یہ کل تھا..

اور آج..

درجنوں خیمے تھے.. کیبن اور ڈائننگ روم اور باتھ روم تھے.. اور فیری میڈو کا نصف حصہ چرواہوں کے اگرچہ دیدہ زیب مگر مخل ہوتے مکانوں سے ڈھک چکا تھا.. تو آج یہ الاؤ بجھ بھی جاتا تو ستارے کہاں اترتے..

ان کے اترنے کے لیے جگہ کم ہو چکی تھی..

آج سویرے سویرے عمران نے مجھے کچی نیند سے بیدار کر دیا تھا اور بیزار کر دیا تھا

''سر.. ہم نے آج تارڑ جھیل کو شوٹ کرنا ہے.. ندی کے اوپر جو لکڑیوں کا کاٹیج ہے جس کی چھت پر آپ کہتے ہیں کہ ان زمانوں میں پھول اُگے ہوئے تھے اور اب اسے گھاس ڈھکتی ہے تو اسے بھی شوٹ کرنا ہے.. پلیز آ جائیے''

جھیل میں پانی بہت کم تھا.. اُس کے کنارے اونچے ہو گئے تھے اور پانی نیچے رہ گئے تھے.. بارش کم ہوئی تھی.. برف کم پڑی تھی.. اسی لیے فنتوری کی ندیاں اور جھرنے خشک اور خاموش تھے.. جنگل میں گھرا ایک ندی پر براجمان وہ شلیے نما لکڑی کا کاٹیج جو میرا پسندیدہ تھا اپنی چھت محض گھاس سے ڈھکتا تھا اور اس گھاس کی ہریاول میں کسی ایک پھول کی بغاوت بھی رنگ نہ دکھاتی تھی..

آج فیری میڈو میں جشن کی شب تھی.. رحمت نبی نے ہم سب کے لیے ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا.. ہماری خاطر ایک بکرا ذبح کیا گیا تھا..

عزیز.. رحمت نبی کا بھائی.. اس کیمپنگ کا نگران ہے.. دوستی کے سوا اس میں چالاکی کا عنصر بھی ہے.. دھاری دار اتیز رکھتا ہے.. وہ اپنے گلے کی مالائیں اور موتی منکے چھنکاتا جو اس نے یقیناً غیر ملکی خواتین کو مسحور کرنے کے لیے زیب تن کر رکھے تھے ہمارے پاس آیا'' تارڑ صاحب.. ایک فرنچ گروپ ابھی ابھی تاتو سے اوپر پہنچا ہے.. اگر تو آپ ابھی فوری طور پر ڈنر کرنا پسند کریں تو ہم سرو کر دیتے ہیں.. اور اگر آپ کچھ دیر اور الاؤ کے گرد بیٹھنا یا رقص کرنا چاہتے ہیں تو ہم فرنچ گروپ کو کھانا کھلا دیتے ہیں.. آپ بعد میں اطمینان سے کھائیے گا.. جیسے آپ کی مرضی''

''بعد میں اے برادر عزیز..''

اور عزیز سر ہلاتا منکے چھنکاتا چلا گیا..

الاؤ کب تک روشن رہتا.. بالآخر بجھ گیا.. کوئی ایک ستارہ بھی نہ گرا..

اس کے انگارے بھی کب تک دہکتے رہتے.. وہ بھی سرد ہو گئے اور تب نانگا پربت کی برفوں نے ہمارے بدنوں پر اپنے یخ ہاتھ رکھے کہ اب تو ہماری جانب دیکھ لو.. اور وہ ہم پر حکمران ہو گئیں.. ہم پر راج کرنے لگیں.. فیری میڈو کی شب سیاہ میں نانگا پربت کی برفوں میں جتنی بھی برف ملکائیں مقیم تھیں.. جو برفانی محل ایستادہ تھے.. برف کے سانپ اور مینڈک تھے وہ سب کے سب جیسے زندہ ہونے لگے.. وہ ملکائیں' محل' سانپ اور مینڈک نانگا پربت کا مسکن چھوڑ کر نیچے فیری میڈو میں اترنے لگے اور انہوں نے ہم سب کو.. وہاں جتنے بھی ذی روح تھے.. درجنوں سیاح تھے.. خیمے اور کیبن تھے.. چرواہوں کے گھر تھے.. جو کچھ بھی فیری میڈو کے بدن پر برص کے داغوں کی مانند تھا.. اس کو نانگا پربت سے اترتے ہوئے طلسم ہوش ربا نے خاک کر دیا.. مٹا دیا.. نابود کر دیا.. سب کچھ مٹ گیا، فنا ہو گیا اور فیری میڈو ایک مرتبہ پھر وہی ہو گیا جو آج سے اٹھارہ برس پیشتر تھا..

قدرت کی بے مثل صناعی میں انسانی ہاتھوں نے جو دراڑیں کھود دی تھیں وہ معدوم ہو گئیں.. جو زخم لگائے تھے وہ بھر گئے..

اوپر تارڑ پتھر کے اوپر فیری میڈو کے سب سے بلند مقام پر.. رائے کوٹ گلیشیر کے کناروں پر.. تیمور جن برفانی دڑوں میں میرے لیے مارخور شکار کرنے گیا تھا ان کے روبرو.. نانگا پربت سے ماتھا لگائے صرف میرا خیمہ تھا.. اور کچھ نہ تھا.. اور صرف میں تھا..

اٹھارہ برس پیشتر کا میرا حدت سے بھرا بدن تھا.. اور کوئی نہ تھا..

اور آسمان سے ستارے اُترتے تھے اور میرے بدن کی حدت میں شامل ہو کر میرے پرجوش خون میں دیے جلاتے تھے..

اور ایک دیے میں فیری میڈو کے ان چھوئے جنگل میں سٹرابیری کے سفید پھول فرش پر بچھتے جاتے تھے.. جو مجھے صدائیں دیتے تھے..

ایک دیا.. چھوٹے فیری میڈو کی درختوں میں پوشیدہ تنہائی میں جلتا تھا.. اور وہاں بھی کوئی نہ تھا.. صرف بیابانی اور حسن کا ذرتھا اور میں تھا..

فیری میڈو ایک مرتبہ پھر وہی ہو گیا.. جو اٹھارہ برس پیشتر ہوا کرتا تھا.. اور میں تنہا.. اس کے ان چھوئے جنگل میں.. دنیا کے سب سے سحر طراز منظر میں یکتا اور تنہا تھا.. میں اس کے سحر کے آگے ہتھیار ڈالتا تھا اور وہ میرے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا..

ایک ایسا بُت جس کا ایک ہی پجاری تھا..

اور وہ بت اس لیے سر جھکاتا تھا کہ میرے معبد میں بہت مشکل سے.. اور بہت تردد سے اگر یہ پجاری آن پہنچا ہے تو میں بھی اس کی تعظیم کروں..

ایک بت تبھی بے رخی برتتا ہے جب اس کے پوجنے والے حد سے بڑھ جائیں.. لیکن اس شب سب کچھ معدوم ہو چکا تھا..

صرف میں تھا اور وہی فیری میڈو تھا جو اٹھارہ برس پیشتر ہوا کرتا تھا..

''تلوار ہے کہ نہیں؟''

میں شب کی ٹھنڈک اور تاریکی میں پردہ پوش خوبانی کے ویران شجر سے واپس گلگت کے اس شالیمار میں آیا جہاں فضل کے ماموں ابھی تک تلوار گھماتے گوٹے کناری سے مزین چوغے میں گھومتے رقص میں مصروف تھے..

''سرجی آپ ماموں سے درخواست کریں کہ وہ اپنے قدیم صندوق میں سے وہ تاریخی تلوار نکال کر لے آئیں.. میں اسے شوٹ کرنا چاہتا ہوں.. پلیز..'' عمران نے پھر میرے کان میں سرگوشی کی..

یہ سرگوشی اکرام کے تیز کانوں میں تیرتی چلی گئی اور وہ سر اُٹھا کو بولا ''تارڑ صاحب.. کوئی تلوار نہیں''

''کیوں فضل.. تلوار ہے؟'' میں نے فضل کے کان میں سرگوشی کی..

فضل بدن جھٹک کر ہنسا اور پھر ڈپلومیٹک ہو گیا ''ماموں کہتے ہیں تو ہے.. ویسے شاید نہیں ہے..''

''بدلتا ہے رنگ گدا کیسے کیسے''

ہم فیئری میڈو سے اُترے تو جا گلگت قیام کیا..

گلگت میں اب بے شمار نئے نویلے ارزاں بھی، مہنگے بھی.. سادہ بھی اور شاندار بھی ہوٹل تعمیر ہو چکے تھے لیکن میرا دل ''چناران'' میں ہی اٹکا ہوا تھا.. مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی.. میں سلجوق کے ہمراہ ''ہنزہ داستان'' کے زمانے میں جب پہلی بار گئی رات گلگت پہنچا تو اسی ہوٹل نے میری میزبانی کی تھی.. اور میں اُس کے بعد جب بھی گلگت میں ہوا تو ''چناران'' میں ہی ہوا.. جیسے ایک مجرم بے اختیار اس جگہ کو لوٹتا ہے جہاں اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا تو میں بھی اُسی بے اختیاری کے تحت ''چناران'' کو ہی لوٹتا تھا..

یہاں اب ہشام ہوٹل کا شیرستان راج کرتا تھا..

اور شیرستان اپنے شیرانہ نام کے باوجود ایک ایسا دوست تھا جس سے دوبارہ ملاقات کی تمنا رہتی تھی..

ہم سب چناران کے ایک کمرے میں کوئی کرسی پر اور کوئی صوفے پر اور کوئی قالین پر براجمان فیئری میڈو کو بھگتانے کے بعد اب اصل ٹریک کی منصوبہ بندی کر رہے تھے..

وادی نلتر کی جھیلوں کے پار درّہ نلتر کو عبور کر کے وادی اشکومن کے گاؤں پکھورا میں اُترنے کی منصوبہ بندی..

یہ ٹریک قدرے مختصر تھا.. صرف پانچ روز کی مسافت تھی.. اور شنید تھی کہ مشکل ہرگز نہ تھا.. آسان تھا.. ''سنولیک'' کے ٹریک کے بعد میں توبہ تائب ہو چکا تھا.. میں اب اس جیسی ہولناکیوں اور برف بلاکتوں کا تمنائی نہ تھا.. آسان سی کوہ نوردی کرنا چاہتا تھا.. اس لیے میں نے

اس مختصر اور آسان ٹریک کا چناؤ کیا تھا۔۔

چنانچہ جب وادی ہلتر تک لے جانے کے لیے جیپوں کے حصول، وہاں سے پورٹروں کو بازکرنے۔۔خوراک خریدنے۔۔راستے میں برفباری کے امکانات اور دیگر جزیات کے بارے میں چھان پھٹک کی جارہی تھی گدا نے اپنے بہرے کان پر ہاتھ رکھ کر گرد آمیز کی معصوم موجودگی میں شکایت کی ایک صدا بلند کی'' سائیں اس مرتبہ مینجمنٹ ٹھیک نہیں ہے۔۔''اور مینجمنٹ کو اس نے ''مے نے ج منٹ''۔۔کہا۔۔

''کس چیز کی مینجمنٹ گدا بھائی؟'' شاہد اپنے حساب کتاب اور پورٹروں اور اخراجات کے تخمینے پر جھکا پین کر عینک اُتار کر سیدھا ہوگیا۔۔

''سائیں خوراک کا بندوبست ٹھیک نہیں''

''نہ کیسے ٹھیک نہیں، کیا گڑبڑ ہے اس میں۔'' میاں فرزند نے حیرت سے پوچھا۔۔

''دیکھیں ناتو میں سائیں گرد آمیز کو رات گیارہ بجے کے بعد کھانا ملا۔۔اور انہیں اتنی دیر سے کھانے کی عادت نہیں۔۔تو یہ کیا مے نے ج منٹ ہے؟''

''یار گدا۔۔''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''تم جانتے ہو کہ بارش شروع ہوگئی تھی ہم سب تھکے ہوئے تھے اور اس کے باوجود میاں فرزند اور ندیم باہر برستی بارش میں ہمارے لیے دا سوکی مرغیاں بنا رہے تھے تو یہ ان کی مہربانی نہیں ہے کیونکہ باقی پوری ٹیم تو خیموں میں دبکی ہوئی تھی''

''کھانا تو رات گیارہ بجے ہی نصیب ہوا ناں۔۔'' گدا کو اتنا سنجیدہ ہم نے پہلی بار دیکھا تھا یہاں تک کہ اس کی مونچھیں بھی ساکت تھیں۔

''اور پھر اس کے جب ہم لوگ بیال کیمپ گئے ہیں تو تارڑ صاحب تو اپنی فلم کے کام میں ہم سب کو بھول گئے۔۔تو وہاں بھی ہم بھوکے رہے۔۔'' گرد آمیز نے مسکراتے ہوئے شکایت کی ''ہم آپ کے ساتھ بھوک سے مرنے کے لیے نہیں آئے سائیں۔''

''لیکن گرد آمیز صاحب۔۔آپ کو یا کسی بھی ممبر کو خوراک مہیا کرنا تو میری ڈیوٹی نہیں۔۔فیئری میڈو کی کیمپنگ میں خوراک کے جو تین چار کارٹن تھے آپ ان میں سے اپنی مرضی سے جو جی میں آتا تھا نکال لیتے اور بیال کیمپ لے جاتے۔۔وہ مشترکہ خوراک تھی''

گرد آمیز بدستور تبسم فرماتا رہا'' سائیں ہم نے ان کارٹن کا بھی معائنہ کیا تھا۔۔ٹین بند خوراکیں تھیں اور دالیں تھیں اور وہ بھی کچی۔۔''

''نہ تو ان کو بھن یا تڑکا لگا ہوتا۔۔'' میاں تلملایا۔۔

''بندوبست ناقص ہے سائیں۔۔'' گدا سر ہلاتا گیا۔''اور پھر آخری رات بھی ہمیں کھانا رات گیارہ بجے کے بعد ملا۔۔سائیں گرد آمیز تب تک سو چکے تھے۔۔یہ کیا مے نے ج منٹ ہے؟''

یہ ناروا اور یکلخت شکائتیں ہم سب کی سمجھ میں نہ آرہی تھیں۔۔گدا ایک مدت سے ہماری کوہ نوردیوں میں شریک تھا۔۔اچھی رفاقت ثابت ہوتا تھا۔۔ٹریک کے اصولوں اور قوانین سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ٹریک کی ہر ذمہ داری۔۔خوراک، قیام، پورٹروں کا حصول وغیرہ ایک مشترکہ ذمہ داری تھی تو وہ کیسے شکایت کر سکتا تھا۔۔

''گدا۔۔'' میں نے خود کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اُسے سمجھانے کی سعی کی'' تم جانتے ہو کہ آخری رات رحمت نبی اور عزیز نے ہم سب کے اعزاز میں ایک بکرا ذبح کیا اور میرے کہنے پر انہوں نے فرنچ گروپ کو پہلے سرو کیا کیونکہ یہ ان کا کاروبار ہے۔۔انہوں نے تو ہم پر مہربانی کی''

''بے شک مہربانی کی ہوگی لیکن سائیں گرد آمیز تو بھوکے سو گئے ناں۔۔''

سائیں گرد آمیز نے ایک مرتبہ پھر ہمیں ایک مسکراہٹ سے نوازا جو کہتی تھی کہ اے عام لوگو تم کیا جانو کہ ہم اپنا ہر کھانا وقت پر تناول فرماتے ہیں اور بھوکے سونے کے عادی نہیں۔۔

''اور رحمت نبی نے تین دنوں کے قیام کے لیے نہ ہم سے کیمپنگ کرنے کی کوئی رقم چارج کی اور نہ متعدد ناشتوں کا کوئی حساب کیا۔''

''یہ تو آپ پر احسان ہوگا سائیں۔۔ہم تو بھوکے مر گئے سائیں۔''

''نہ جی گدا صاحب۔۔'' میاں فرزند کچھ زیادہ ہی تلملا گئے'' میں نے پوری شام لگا کر فیئری میڈو میں آپ کے لیے حلوہ نہیں بنایا تھا۔۔''

''حلوہ؟'' گرد آمیز مسکراہٹ ترک کر کے ایک واجبی سے تضحیک آمیز قہقہے میں مبتلا ہوا'' وہ کیا حلوہ تھا سائیں۔۔ایسا حلوہ تو کسی قبرستان میں نذر نیاز کے لیے بھی قبول نہیں ہوتا۔۔میٹھا کم تھا اور سوجی بھونی ہوئی نہیں تھی۔۔کچا حلوہ تھا سائیں۔۔سائیں ہم ٹیم کے اخراجات میں حصے دار ہیں کوئی مفت میں تو آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔۔''

ہم سب کے منہ حیرت اور دکھ سے کھلے تھے۔۔یہ ہماری کوہ نوردی کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔۔

''دیکھیں گرد آمیز۔۔'' میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا'' مجھے بے حد افسوس

ہے.. میرے تمام ساتھی بھی بے حد شرمندہ ہیں کہ آپ کو تاتو کی رات میں گیارہ بجے کھانا ملا.. بیال کیمپ میں خوراک کا بندوبست نہ ہوا.. آخری شب ڈنر میں تاخیر کے باعث آپ بھوکے سو گئے.. اور میاں فرزند کا حلوہ آپ کی منشا کے مطابق نہ تھا.. یقیناً آپ کی درگاہوں میں حلوے کے جو چڑھاوے چڑھتے ہوں گے وہ اس حلوے سے کہیں شیریں اور مزیدار ہوتے ہوں گے اور مفت ہوتے ہوں گے لیکن ہم لوگ کاروباری ٹور آپریٹر نہیں ہیں.. ساتھی اور دوست ہیں.. آپ نے نہایت لجاجت سے درخواست کی تھی کہ سائیں پلیز مجھے بھی ساتھ لے چلیں میں نے آپ کی منت نہیں کی تھی.. روانگی سے پیشتر آپ کو پہاڑی سفر کی مشکلات سے آگاہ کر دیا تھا اور آپ جواب میں جی سائیں جی سائیں کہتے رہے تھے.. اور گدا کی سفارش پر آپ کو شامل کیا گیا تھا.. اب میں آپ کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور میری عرض ذرا غور سے سنئے گا.. کہ ملتر پھسورا ٹریک کے دوران ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی بدتر بندوبست ہوں.. اگر آپ متحمل نہیں ہو سکتے تو بے شک یہیں سے واپس ملتان تشریف لے جائیے.. ہم لوگ اس سے بہتر نہیں ہو سکتے.. اور نہ ہی میں اس قسم کے سلوک اور شکائتوں کا عادی ہوں.''

گرو آمیزی کی مسکراہٹ سمٹ گئی.. اور پھر وہ یکدم فرینڈلی اور چارمنگ ہو گیا'' نہ سائیں نہ.. ہم تو دوستوں کے لیے جان دے دیتے ہیں.. یہاں تک آ گئے ہیں تو آگے بھی چلیں گے آپ کے ساتھ..''

گدا نے گرو آمیزی کی مصالحت آمیزی کو ناپسند کیا اور کہنے لگا'' لیکن اس بارے نے ج منت ٹھیک نہیں سائیں..''

''یار آئی ایم سوری.. آئندہ میں اگر بہن یا حلوہ بناؤں تو جو چور کی سزا وہ میری..''

میاں فرزند نے عینک جھٹک کر چہرے سے الگ کی اور سلیپنگ بیگ میں روپوش ہو گئے..

''لیڈر کی تقریر اور پورٹر سامان اٹھانے سے انکاری ہو جاتے ہیں''

باہر کوئی لیڈر نما شخص تقریر کر رہا تھا..

اس کی پرجوش آواز ملتر ہوٹل کے اس تاریک اور کچے غسل خانے کے اندر تک آ رہی تھی جہاں ایک کموڈ نما شے پر میں اپنی جبین سرکائے براجمان.. اپنی بزباتی خرابیٔ پیٹ کی اصلاح کے عمل میں ہمہ تن مشغول تھا..

میں سب بندوبست کر چکا تھا.. سب کچھ طے پا چکا تھا.. کتنے پورٹر ہوں گے.. روزانہ مزدوری کتنی ہوگی.. پانچ روزہ ملتر پھسورا ٹریک کے لیے سب تفصیلات مکمل ہو چکی تھیں.. پورٹر سامان اپنے کندھوں پر بوجھ کئے تیار بیٹھے تھے اور صرف میرے منتظر تھے.. چلنے کو تھے کہ میرے تن بدن میں ہنگامی حالت کا اعلان ہو گیا اور میں انہیں صبر کی تلقین کرتا خود بے صبری سے اپنی جبین سنبھالتا ایمرجنسی سے فراغت حاصل کرنے کے لیے یہاں اس تاریک اور کچے غسل خانے میں آ بیٹھا تھا.. لیکن باہر کوئی لیڈر نما شخص تقریر کئے چلا جا رہا تھا..

گلگت سے وادی ملتر کی جانب جیپوں میں کوچ ہوا..

دریا پار شاہراہ ہنزہ تھی اور اس کنارے پر نوّل کو جانے والی روڈ اب پہلے کی نسبت کشادہ اور پکی تھی..

نوّل کی باغ و بہار بستی.. شاداب اور دریا کی قربت میں ٹھنڈک والی.. جہاں عینی کی ایک چین فرینڈ.. ایک اور عینی رہا کرتی تھی..

اس ٹول میں ہماری جیپ کے ڈرائیور نے اپنی خالہ کے گھر کے اندر جا کر دیواروں اور چھتوں پر پھیلتی انگوری بیلوں سے وہ خوشے اتارے تھے جن کے تازہ ذائقے نے ہمارے حلق میں رس گھولے تھے..

ملتر ہمارے لیے ایک عارضی پڑاؤ تھا..ہم نے وہاں دوپہر کا کھانا تناول کرنا تھا، پورٹروں کا بندوبست کرنا تھا اور آگے نکل جانا تھا..

ہمارے ہمراہ راہبری کے لیے اعظم چلا آیا تھا جو گلگت کے ایک سفری ادارے میں ملازم تھا..کہ تارڑ صاحب میں ملتر تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں..آپ کے لیے پورٹر وغیرہ فراہم کر کے واپس آ جاؤں گا..اور وہ بے حد مددگار ثابت ہوا.. پورٹروں کے ساتھ تمام معاملات طے کیے..ادائیگی کیسے ہوگی..کہاں پہنچ کر ہوگی..کتنا وزن اٹھانا ہے وغیرہ وغیرہ.. بوجھ ترازو پر تولے گئے،ہر پورٹر نے اپنے حصے کا سامان باندھا..کچھ نے اپنے بدن پر باندھا اور کچھ نے دو گدھوں پر اور چلنے کو تیار ہو گئے..سب لوگ چلنے کو تیار ہوتے ہیں تو میرے پیٹ میں کچھ بڑبڑاتی دھماچوکڑی سی مچی جو یقیناً ان انگوروں کی عطا کردہ تھی جو میں نے ٹول میں نہایت رغبت سے نوش کیے تھے.. میں نے روانگی سے پیشتر اس کا سد باب کرنا مناسب جانا اور ہوٹل کے کچے اور تاریک غسل خانے میں جا براجمان ہوا..اور یہیں پر تھوڑی دیر بعد مجھے لیڈر کی بلند آہنگ تقریر سنائی دینے لگی..

میں اپنی جین سنبھالتا نیم تاریکی میں سے باہر کی تیز روشنی میں آ گیا..

کیا دیکھتا ہوں کہ ہماری ٹیم کا کل سامان ایک جانب ڈھیر ہے اور ہمارے حاصل کردہ پورٹر اپنے کندھے اور گدھے خالی کیے ایک نوجوان لیڈر نما شخص کی مسلسل اور جذباتی تقریر منہ کھولے نہایت دھیان سے سن رہے ہیں..

معلوم ہوا کہ پورٹروں نے اس لیڈر کے کہنے پر ہمارا سامان اٹھانے سے انکار کر دیا ہے جب تک طے شدہ روزانہ مزدوری میں سو روپے کا اضافہ نہ کیا جائے اور اس کے علاوہ بھی متعدد ڈیمانڈز تھیں..

یہ صورت حال نہایت حیران کُن تھی..میں پورٹروں سے مخاطب ہوا'' بھائیو اب کیا ہوا ہے؟..ابھی ابھی نہایت خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے پا گئے تھے..روزانہ مزدوری..کتنی منزلوں کی مزدوری ادا کی جائے گی..بکرا کب پیش کیا جائے گا..اور آپ لوگ چلنے کو تھے جب مجھے بلاوا آ گیا تو اب کیا ہوا ہے؟''

پورٹروں نے خاموشی اختیار کر لی..

لیڈر مسلسل تقریر کیے جا رہا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی انقلاب آ جائے گا اور ''پورٹر'' دنیا بھر کے پورٹرو ایک ہو جاؤ'' کے نعرے لگاتے ہوئے ہم پر دھاوا بول دیں گے..تب لیڈر میری جانب متوجہ ہوا اور تقریر کی والیوم بلند کر دی'' ہم غریب لوگ ہیں..سیاحوں اور کوہ نوردوں کے بوجھ ڈھوتے ہیں..اور آپ جیسے لوگ ہماری مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں..ہمیں صرف ڈھائی سو روپے روزانہ ادا کرتے ہیں جب کہ آپ کی کمپنی سیاحوں سے چھ سو روپے چارج کرتی ہے..ہم لوگ آپ کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے..نہیں اٹھائیں گے..آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے..نہیں جائیں گے..جب تک کہ ہماری ڈیمانڈز پوری نہیں کی جاتیں..''

'' بھائی صاحب..ہم زبردستی تو نہیں کر رہے..'' میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی '' ابھی ابھی پورٹروں کے ساتھ تمام معاملات طے کر لیے گئے تھے ان کی خواہش کے مطابق ادائیگی ہو رہی تھی..جب آپ تشریف لے آئے..''

'' یہ تو بھولے لوگ ہیں..سادہ لوگ ہیں آپ کی باتوں میں آ گئے..ہمیں یہ ریٹ منظور نہیں '' لیڈر بخوبی جانتا تھا کہ ہم پتہ نہیں کہاں سے اور کن مصیبتوں اور طویل مسافتوں کے بعد مارومار کرتے یہاں ملتر پہنچے ہیں اور بہر صورت ہم نے اس ٹریک پر جانا تھا..اس لیے وہ ہمیں بلیک میل کر رہا تھا..

'' دیکھیں یہ کسی سیاحتی کمپنی کا ترتیب شدہ ٹور نہیں..چند دوست ہیں جو ہر برس آپ کے علاقے میں آتے ہیں اور یقین کیجیے نہایت حق حلال کی روزی خرچ کر کے آتے ہیں اور جب گھر واپس جاتے ہیں تو بیویوں کے طعنے بھی سنتے ہیں کہ اتنی رقم برباد کر کے آ گئے ہو کالے سیاہ ہو کر..ہم کوئی تجارتی لوگ نہیں..ہم نے سرکاری شیڈیول کے مطابق پورٹروں کے ریٹ طے کیے ہیں..''

'' ہم سرکاری شیڈیول کو نہیں مانتے'' لیڈر دھاڑا '' ہم اپنے ریٹ مانگتے ہیں نہیں تو چلے جایئے ہمارے علاقے سے..''

صورت حال نہایت تشویش ناک ہو چکی تھی..دوپہر ڈھل رہی تھی اور اگر ہم فوری طور پر یہاں سے روانہ نہیں ہوتے تھے تو ملتر جھیلوں تک پہنچتے رات ہو سکتی تھی..میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا اور لیڈر کی ٹھوڑی مضبوطی سے گرفت میں لے کر اس کا تقریر کرتا چہرہ اپنی جانب کیا.'' آپ کون ہیں؟..

"میں التر سکول میں ٹیچر ہوں اور عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہوں.."

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں!"

"شائد.."

"شائد نہیں..اگر نہیں جانتے تو میں اپنا تعارف کروا سکتا ہوں.."

"آپ تارڑ صاحب ہیں.."

"تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جسے آپ ہمارا علاقہ کہہ رہے ہیں میں ہر برس اس علاقے میں دھکے کھانے کے لیے آ جاتا ہوں اور پھر واپس جا کر کتابیں لکھتا ہوں جنہیں پڑھ کر بہت سے لوگ ادھر کا رخ کرتے ہیں اور یوں آپ کے روزی روزگار میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے..یہ جانتے ہیں؟"

"ہاں صاحب.."

"اور اس کے باوجود..اس علاقے میں میری محبت کے باوجود..آپ میری ٹیم کے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہیں..معاون ثابت ہونے کی بجائے ہمیں ذلیل کر رہے ہیں..سنیے لیڈر صاحب..سکردو میں..گلگت میں..سوات اور کاغان میں ایسے بہت سارے مہربان ہیں جو مجھے اپنے علاقوں میں خوش آمدید کہنے کے خواہش مند ہیں تاکہ میں ان کے بارے میں بھی کچھ تحریر کروں..اب اگر میں نے آپ کی وادی کو چنا ہے تو آپ مجھے اس کی سزا دینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں صاحب..میں تو صرف عوام کے حقوق کی بات کر رہا ہوں"

"ٹھیک ہے اگر آپ دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے اور ان معصوم لوگوں کو ان کی جائز روزی سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی..ہم جن جیپوں پر یہاں آئے تھے وہ ابھی تک گلگت واپس نہیں گئیں..ہم انہی پر سوار ہو کر گلگت چلے جاتے ہیں.."

لیڈر نے کچھ نہ کہا.

"چلیں میاں صاحب..سامان جیپوں میں لوڈ کروائیں" میرے ذہن میں مکمل منصوبہ تھا التر ٹریک ترک کیا جاتا ہے..آج رات گلگت میں جا بسر کریں گے اور کل صبح اکرام بیگ کی معاونت سے ہم بتورہ گلیشیئر کے ٹریک پر چلے جائیں گے..

میرے ساتھیوں نے سامان اٹھانا شروع کر دیا.

پورٹر جو ابھی ابھی اس لیڈر کو نہایت اشتیاق بھری نظروں سے تک رہے تھے اس

کارروائی کو دیکھ کر اس کے گرد ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر سوال جواب کرنے لگے..وہ جان گئے تھے کہ ہم گلگت واپس چلے جانے کے بارے میں سو فیصد سنجیدہ ہیں..اور ہم تھے..قدرے توقف کے بعد لیڈر میرے پاس آ گیا.."سر ہم آپ کی بہت قدر کرتے ہیں..شمال میں اگر ہم باہر کے کسی شخص کی عزت کرتے ہیں تو وہ..صرف آپ ہیں"

"آپ نے کیا خوب عزت کی ہے میری..تھینک یو"

"دراصل آپ کے ہمراہ وال جیز ٹورز کا جو شخص ہے اُسے دیکھ کر مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ کمپنی کا ٹور ہے..یقین جانئے یہ لوگ ہمارے مزدوروں کو بہت کم رقم دیتے ہیں اور سیاحوں سے ہماری مزدوری کے کھاتے میں تین چار گنا زیادہ پیسے وصول کرتے ہیں"..."ہم لوگ سارا سال گرمیوں کے ان دو تین مہینوں میں روزی کمانے کی آس میں گزارتے ہیں..آپ سے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے"..

"آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آیا تھا کہ یہ ایک تجارتی ٹور نہیں ہے.."

"صرف اس شخص کی وجہ سے جو آپ کے ساتھ ہے..؟"

"تو پھر چلے جائیں گلگت؟"

"نہیں جائیے سر.." وہ مسکرانے لگا..اور اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی" آپ کے ساتھ تو پورٹر مفت بھی جانے کو تیار ہیں.."

"تھینک یو"

لیڈر اب نہایت بے لوث ہو کر پورٹروں کو تلقین کر رہا تھا کہ صاحب اور اس کی ٹیم کا خیال رکھنا..انہیں تنگ نہ کرنا..

"روانہ ہو جائیں سر..دیر ہو رہی ہے" اس نے نہایت خوشدلی سے کہا.

پھر سے گہما گہمی شروع ہو گئی..پورٹر سامان اٹھانے اور باندھنے لگے..گدھے پھر سے لوڈ ہونے لگے..

شمال کے بیشتر باسی دل کے کھرے ہیں..وقتی اُبال آتا ہے اور پھر پرسکون ہو جاتے ہیں..اور یہ اُبال بھی کسی حد تک جائز ہے کہ ان کی محرومیاں اور مایوسیاں بہت ہیں..زندگی کٹھن اور پتھروں سے بھری ہوئی ہے..نامہربان موسموں اور دشوار زندگی کے ستائے ہوئے یہ لوگ پورا سال ان مہینوں کے منتظر رہتے ہیں جب یہاں سیاح اور کوہ نورد اترتے ہیں اور ان کو روزی روزگار کی صورت نظر آتی ہے تو وہ بے چین ہو کر ذرا جوشیلے اور بے احتیاط ہو جاتے ہیں..

''ٹریک کا پہلا قدم.. بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں''

ملتر ہوٹل سے قافلہ نکلنے لگا..

جب اس کے دو کمروں کے سامنے والی گھاس پر سے تمام بوجھ اُٹھ گئے.. پورٹر اور گدھے نکل گئے تو ہم سب باری باری اپنے رُک سیک اٹھائے اس راستے پر گامزن ہوئے جو وادی ملتر کے دل میں سے سفر کرتا آج شب کی منزل.. ملتر جھیلوں کو جاتا تھا..

ایک پہاڑی سفر کے آغاز کا.. ایک ٹریک.. ایک کوہ نوردی کا سب سے ہیجان خیز اور مسرت سے اُبلتا دمکتا ہمکتا اور چنچل لمحہ بس یہی ہوتا ہے.. جب پورے برس کی منصوبہ بندی کے بعد.. ایک خواب کی تکمیل کا پہلا لمحہ.. مشوروں اور تجربہ کار کوہ نوردوں سے ہم کلامیوں کے بعد.. خوراک.. خیموں اخراجات کے تخمینے اور دیگر ضروریات کے حصول کے بعد.. اور سب سے اہم.. پورٹروں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے بعد جب آپ اس ٹریک پر روانہ ہونے کے لیے پہلا قدم اُٹھاتے ہیں.. تو جیسے بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں.. اس شوق اور خوشی سے.. ایک نئی زندگی کی خواہش میں.. تو تقریباً ایسی سرخوشی میں ڈوبے ہوئے.. ایک آوارہ گرد ایک کوہ نورد کہیں بلند پہاڑوں میں جانے کے لیے.. پہلا قدم اٹھاتا ہے..

وہ بھی ایک برس تک معاشرے اور خاندانی بندھنوں کے فرعون کی غلامی کرنے کے بعد اُس سرزمین کی جانب جاتا ہے جس کا اُس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا..

آبادیوں اور تہذیب کے کفار اور مُشرک اس کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور وہ وہاں

سے ہجرت کر جاتا ہے..

تو یہ پہلا قدم تمام کلفتیں اور غلامی کی صدیاں بُھلا دیتا ہے..

جیسے ایک عشق خاص برسوں کی جدائی پہلی نظر میں بھلا دیتا ہے..

یوں میں نے پہلا قدم رکھا..

میرے ساتھی کوہ نوردوں کے احساسات بھی مجھ سے جدا نہ تھے..

گرد آمیز کی مسرت دیکھنے کے لائق تھی.... وہ ایک رولی پولی ٹیڈی بیئر کی طرح ادھر اُدھر لڑھکتا اپنے متعدد کیمرے سنبھالتا ہر اس شے کی تصویر اتارتا تھا جو اس لائق نہ تھی کہ اس کی تصویر اُتاری جائے.. اور اس میں میں بھی شامل تھا.. گدا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ گرد آمیز کو اپنی ہتھیلیوں پر چلانا چاہتا تھا.. سائیں ذرا دیکھ کر چلیں.. ادھر پانی ہے.. ادھر گہرائی ہے سائیں.. ٹھنڈا کھلا پانی حاضر کروں سائیں.. سائیں بلندی ہے آہستہ چلیں سانس پھول جائے گا.. گدا ہمارے وجود سے یکسر غافل ہو چکا تھا بلکہ ہم میں سے کوئی ایک جب گرد آمیز سے آگے نکلتا تھا تو وہ خفا ہو جاتا تھا کہ سائیں فوٹو اُتارتے ہیں آپ ادھر پاسے ہو جاؤ..

حسن اپنی بیوی کے عشق میں فنا اور دیار ہر منظر کے سامنے آنے پر اس کی یاد میں ایک ہوکا بھرتا تھا اور مسکراتا تھا..

شاہد نہایت متانت سے قدم دھرتا میاں صاحب سے چہلیں کرتا چلتا تھا..

صرف ایک قلق تھا کہ ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں جو وادی ملتر کو ہم سے جُدا کرتی تھیں..

پیچھے سے.. ملتر کی جانب سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور زرد رس بھری خوبانیوں کی ایک پوٹلی ہمیں پیش کر دی..

یہ خوبانیاں لیڈر نے خاص طور پر ہمارے لیے بھجوائی تھیں..

میں اور خان سلیم برابر میں چلتے تھے.. اور بیوقوف مگر آزاد پنچھیوں کی طرح چہچہاتے ہوئے چلتے تھے..

''تارڑ صاحب.. یہ عشق کیا چیز ہے؟'' سلیم نے یکدم سوال کیا..

''یار ٹریک کے پہلے دن.. پہلے قدموں پر.. اتنا مشکل سوال نہیں پوچھا کرتے..''

''میں انتظار کر سکتا ہوں..'' اُس نے اپنے غیر متوازن دانت نمائش کیے'' ابھی پانچ

روز کا پہاڑی سفر باقی ہے''

میاں اور شاہد ایک ایسا جوڑا تھے جو اگرچہ مدتوں سے شادی شدہ تھا لیکن ابھی تک وہ ایک دوسرے کو جل دے رہے تھے.. اور جل دینے میں شاہد ایک ایکسپرٹ تھا..

حسن کے چہرے پر وہی معصوم مسکراہٹ تھی جو ایک بچے کے چہرے پر پہلی بار آئس کریم چکھنے پر پھیلتی ہے..

ندیم نے ہم سے بے وفائی کی تھی.. فیری میڈو میں ساتھ دینے کے بعد گلگت میں رہ گیا تھا کہ اس کا بینک اس کی طویل غیر موجودگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا.. اور ہم سب اس کی کمی کو محسوس کرتے تھے..

عمران اور اس کے بغل بچے.. ہماری نسبت بوجھ اٹھانے والوں گدھوں کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور ان کی تھوتھنیوں اور دیگر اعضاء کو شوٹ کر رہے تھے..

مجھے وہی الجھن ہو رہی تھی..

ہم ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے..

ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں.. ذاتی جائیداد کی حرص نے وادی کو اور اس کے منظر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا..

میں اس سے پیشتر صرف ایک بار ملتر آیا تھا.. اپنے خاندان کے ہمراہ.. اور ملتر ہوٹل سے آگے نالے کے پار ایک نہایت پوش وی آئی پی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا جس کی بکنگ مجھے اتفاقاً مل گئی تھی.. میں اس زمانے میں جہاں اس وادی کی گھنی سرسبز ٹھنڈک اور بھید بھرے سیاہ جنگلوں میں سائیں سائیں کرتی شفاف ہواؤں سے متاثر ہوا تھا وہاں اس کے مکمل سناٹوں نے مجھ میں ہول بھر دیا تھا.... یہاں اتنی تنہائی تھی کہ دکھ دیتی تھی.. اتنی خاموشی تھی کہ ڈراتا تھا.. صرف ایئر فورس کی موجودگی اور سکی لفٹ اس ویران مگر دل پر بلندی اور ٹھنڈک کے ہاتھ رکھنے والی وادی کو کچھ رونق بخشتے تھے..

لیکن اب.. جو کچھ کل جہان میں ہو رہا تھا.. وہ یہاں بھی ہوا تھا.. ملتر بہت پھیل چکا تھا.. بڑا ہو چکا تھا.. یہاں اب میدانوں سے آنے والوں نے ذاتی گھر تعمیر کر لیے تھے.. اس رونق نے سناٹوں کو دھکیل دیا اور ان کے ساتھ کچھ خوبصورتی بھی دھکیلی گئی.. لیکن کیا کیجیے.. یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا تھا جو کل جہان میں ہو رہا تھا..

ابھی کچھ دور گئے ہیں تو دائیں جانب مقامی آبادی اور کھیت کچھ کم ہوئے اور ایک شاندار ہوٹل کی عمارت دکھائی دی جو تعمیر تو ہو چکی تھی لیکن تکمیل تک نہیں پہنچی تھی.. اس کے نگران جو صاحب تھے وہ شاید بیکار بیٹھے تھے چند کوہ نوردوں کو گزرتے دیکھ کر برآمدے میں سے اُٹھے اور ہمارے پاس آگئے.. ''صاحب ہوٹل کے تین کمرے بالکل تیار ہیں.. رات ادھر گزاریئے'' یہ دل کو خوشی سے بھر دینے والی پیشکش تھی کہ یہ ہوٹل آرام دہ لگتا تھا.. قدرتی منظر کا حصہ تھا اور اس کی کھڑکیوں میں کچھ نیلی چٹانیں، دو آبشاریں، بہت سی برفیں نہ صرف دکھائی دیتی تھیں بلکہ اندر آتی تھیں.. ہم تھکے ہوئے بھی تھے.. ہم اپنے آپ پر جبر کر کے آگے بڑھ گئے.. کیونکہ ٹریک میں حساب کتاب بہت ہوتا ہے.. منزلوں، پورٹروں اور آپ کو فلاں دن وصول کرنے والی مختصر جیپوں کی تاریخوں کا حساب اور آپ اپنے من کی موج میں جہاں جی چاہے ٹھہر نہیں سکتے.. شیڈیول کی پابندی کرنی پڑتی ہے.. اس راستے میں مویشی ہانکتے، بھیڑیں چراتے، گدھے آگے لگائے، گھروں کو لوٹتے جتنے کسان اور مقامی لوگ ملے وہ سب سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے..

ایک کسان مجھ سے آگے اپنی گائے کو ہانکتا چل رہا تھا.. میں اس کے برابر میں جا پہنچا'' جھیلیں کتنی دور ہیں؟''

''پاس ہیں..'' اس نے اطلاع دی..

گائیڈ بکس میں بھی یہی اطلاع تھی.. ملتر ہوٹل میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ ہم وہاں آسانی سے تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے.. لیکن جب اس کسان بھائی نے یہ کہا کہ ''پاس ہیں'' تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ شمال میں جب کوئی مقامی شخص کسی بھی مقام کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ.. پاس ہے.. تو جان لیجیے کہ وہ ہرگز پاس نہیں بہت دور ہے.. اور اس پاس تک پہنچتے پہنچتے آپ بالکل فیل ہو جائیں گے..

ہم بہت بلند کناروں پر تھے اور نیچے دریا کا پھیلاؤ تھا جس کے پار نیلی چٹانیں بہت بلندی تک جاتی تھیں برفیں ٹھہری ہوئی تھیں اور ان میں سے دو آبشاریں گرتی تھیں..

راستے میں ٹائروں کے نشان ثبت تھے اور ہم دھیرے دھیرے کچھ پچھتائے کہ جھیلوں تک جانے کے لیے جیپوں کا سہارا کیوں نہ لیا..

اگرچہ اس راستے پر جیپیں بھی آسانی سے نہیں چلتی ہوں گی..

آبادی کم ہو گئی.. اور آس پاس بھی گھنے شجر سایہ کرنے لگتے.. راستہ نیچے دریا تک آیا اور

پھر بلند ہوگیا..

دوسری جانب سے پہلے ایک ٹریکٹر آیا جسے راستہ دینے کے لیے ہم ڈھلوان پر اترے اور اپنے آپ کو بمشکل گرنے سے بچایا.. پھر ایک لینڈ کروزر نمودار ہوئی جس میں ایک غیر ملکی براجمان تھا.. اس لینڈ کروزر نے بھی ہمیں پریشانی میں مبتلا کیا کہ راستہ بہت تنگ تھا..

پھر ایک اور جنگل کا آغاز ہوگیا.. یہ گھرا اور نیم تاریک تھا.. اس کے اندر شام ہوگئی.. باہر آئے تو وہ شام پھر سے دن میں بدل گئی..

پانچ بج گئے لیکن جھیلوں کی قربت کے کوئی آثار نہ تھے..

ہم تھکنے لگے..

سفر کے آغاز کی چلبلاہٹ اور نوخیزی دم توڑنے لگی.. ہم ذہنی طور پر تین چار گھنٹوں میں جھیلوں تک پہنچنے والے تھے اور نہیں پہنچے تھے.. پہلے صرف جنگلوں کے اندر شام تھی اب باہر بھی اُترنے لگی..

گرد آمیز کی مسکراہٹ سست چکی تھی اور اس کے کیمرے واپس کیسوں میں جا چکے تھے اور وہ بار بار پوچھتا تھا کہ سائیں آپ نے تو کہا تھا کہ ہم تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے تو نہیں پہنچے.. جھیلیں کہاں ہیں؟..

''گرد آمیز.. جھیلوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا.. یہ تو کبھی عمر بھر کی مسافت کے بعد بھی نہیں ملتیں.. آپ تو ابھی صرف پانچ گھنٹے چلے ہیں..''

''دریائے برالڈو کے چھوٹے بھائی کے وحشی پانیوں میں ڈوبتا ابھرتا ایک متروک شدہ اداکار.. اور ایک بکری''

ہمیں مسلسل بتایا جا رہا تھا کہ.. جھیلیں بس قریب ہیں.. کوئی گھر کو لوٹتا کسان.. کوئی گمشدہ سا تھا ایک بکری ہانکتا ہوا.. اور کوئی گڈریا شام سے پہلے اپنی گڈرین کے پاس پہنچنے کی خواہش میں.. یہ ہمیں مسلسل بتاتے تھے کہ جھیلیں اب بہت قریب ہیں.. پاس ہیں صاحب.. جب میرے کانوں وہ آبی شور اُترا..

وہ آبی شور جس کی دہشت بدن کو ڈر کے سناٹے میں اُتار دیتی ہے.. اُس میں سے جان نکال دیتی ہے.. ور گوتھ کی ندیوں ایسا ہولناک آبی آہنگ.. اور وہ بھی سر شام.. جب صور پھونکا جائے گا تو اس سے ملتی جلتی دہشت.. آپ اپنے تئیں بہرے بن جاتے ہیں.. پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ ایک واہمہ ثابت ہو.. اور وہ واہمہ نہیں ہوتا دل کو مٹھی میں لے کر نچوڑ دینے والی ایک حقیقت ہوتی ہے.. وہ خبر کرتی ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کے آگے شاید اس ٹیلے کے پار بلند پہاڑوں سے اُترنے والا مہیب گرجدار اور دہاڑ کرنے والا ایک نالہ ہے جسے تم پار نہیں کر پاؤ گے..

ہمیں کسی نے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وادی ہکلتر سے جھیلوں کو جاتے ہوئے کوئی ایک نالہ بھی راستے میں آتا ہے.. نہ پورٹروں نے، نہ گائیڈ جس نے اور نہ کسی ٹریکر نے بتایا تھا.. ہر ایک نے یہی کہا تھا کہ جھیلیں.. وادی ہکلتر سے صرف تین گھنٹے کی آسان مسافت پر.. سرگشت کرتے.. ہرے بھرے جنگلوں میں چلتے.. گپیں لگاتے.. ایک خوشگوار روک کے بعد آپ کے سامنے ہوں گی..

اور سامنے کیا آتا ہے..

درگوتھ کی ایک سفید اور وحشی ندی کا بڑا بھائی.. بلکہ بھائی جان.. ایک نالہ.. جو نالہ تو کیا تھا دریائے برالڈو کا چھوٹا بھائی تھا.. بلندی سے اُترتا.. بلند کناروں کے بیچ سر پٹختا.. کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی.. کُل کائنات میں یہی آبی شور ہے اور اس کے سفید مرگ صفت پانیوں میں سے ہر لحظہ اناللہ.. کی صدائیں آرہی ہیں.. ہم ہرگز اس کے پار نہیں جا سکتے تھے..

کوہ نوردی کا کھیل تماشہ ختم ہو چکا تھا اور ہم سب اس کے کناروں پر کھڑے ڈر نے بدن کو جو بے اختیار کپکپاہٹ عطا کی تھی اس پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے..

ہم کھیل تماشے میں پہاڑوں کے شیر کی دم سے کھیلتے رہے تھے اور اب اس نے پیچھے مڑ کر دھاڑنا شروع کر دیا تھا..

''صاحب..'' ایک پورٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا'' ہم تو صاحب کسی نہ کسی طرح پار چلے جائیں گے لیکن آپ کے لیے بہت مشکل ہے.. اس میں اگر گرتے ہیں تو پھر یہ آپ کو اُٹھنے نہیں دے گا..''

''اس کے بارے میں ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا..''

''یہ دن کے وقت تو بہت آسان ہوتا ہے صاحب''.. پانی کم ہوتا ہے بچے بھی گزر جاتے ہیں.. آپ کی غلطی ہے.. آپ عسر سے بہت دیر میں چلے.. اب شام ہو رہی ہے تو یہ کناروں تک بھر گیا ہے..''

اور یہ نالہ وہ ہرگز نہیں تھا جس کے بارے میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ اس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے..

یہاں نہ خاموشی تھی اور نہ یہ نالہ بلند ہوتا تھا بلکہ بلندی سے نیچے آتا تھا..

اب میں اس امکان پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا.. اور اس امکان کو نالے کا پُر دہشت شور اور چنگھاڑ تقویت دے رہے تھے کہ رات اسی کنارے پر کر لی جائے اور اسے کل سویرے جب اس کے پانی اُتر چکے ہوں گے عبور کیا جائے جب عمران وڈیو کیمرے کے کالے برقعے میں سر دیئے اسے ایک توپ کی طرح میرے چہرے کے قریب لاتا اندر ہی اندر بولا'' چلو جی تارڑ صاحب..''

''کہاں چلو جی..'' میں نے لرزتے ہوئے دریافت کیا..

''اس نالے میں.. آپ اب ایک نڈر اور جانباز لیڈر کی حیثیت سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر.. بلکہ ہتھیلی پر رکھ کر ٹیم کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس نالے میں

اترتے ہیں.. چلیں''

''مثال قائم کرتا ہوں اور پھر ڈوب جاتا ہوں''

''مثال قائم کرنے والے ہمیشہ ڈوب جاتے ہیں سر.. یہی ہوتا چلا آیا ہے.. آپ ہمت کریں''

''عمران تم میری جان کے ویری ہو؟''

''سر دیر نہ کریں.. ساؤنڈ سسٹم آن ہے.. بیٹریاں آن ہیں.. کیمرہ آن ہے۔''

''نہیں یار.. کسی اور کو اُتار دو''

''لیڈر آپ ہیں.. اور اس ڈاکومنٹری کے ہیرو آپ ہیں.. آپ ہی پہلے اُتریں گے''

''یار اتنے بلند کنارے سے پہلے نیچے اُتروں اور پھر اس آتش نمرود میں کود جاؤں بنا کسی پیغمبری کے.. تم دیکھ نہیں رہے کہ پانی کی تندی ایسی ہے کہ پتھروں کو بھی لڑھکا رہی ہے.. میں پہلا قدم رکھوں گا تو میری قلابازی لگ جائے گی.. پار اُترنا تو دور کی بات ہے''

پورٹر اس مکالمے سے لطف اندوز ہو رہے تھے.. میرے ساتھیوں میں سے بھی کوئی میری مدد کو نہ آیا.. انہیں خفیف سا احتجاج تو کرنا چاہیے تھا کہ عمران ہمارے لیڈر کو مجبور نہ کرو.. اور وہ ایک ہاتھ سے اپنی نیکر ٹٹول رہا تھا.. پھر اُسی ہاتھ سے داڑھی کھجاتا تھا'' یہی تو میری زندگی کا بہترین شاٹ ہوگا سر.. کہ ایک سیلف سٹائلڈ باباجی کوہ نورد جو باہر کی دنیا کو اپنے ہولناک پہاڑی اور برفانی سفروں کی داستانیں سنا سنا کر مرعوب کرتا ہے وہ اب ایک وحشی پہاڑی نالے میں بے خطر کود پڑتا ہے..''

''بے خطر کود پڑتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے عمران؟''

''تو پہلے قدم کے بعد اس کی قلابازی لگ جاتی ہے.. پانی میں گرتا ہے.. سنبھل نہیں سکتا اور کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے.. اور تب سکرین پر صرف اس نالے کے پُرشور پانی دکھائی دیتے ہیں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا.. وہ غائب ہو چکا ہے اور پھر پاکستان کا قومی ترانہ بجتا ہے کہ عجب آزاد مرد تھا.. یہ اس کی زندگی کا آخری شاٹ ہے جس میں وہ آزاد مرد ادھر ڈوبا اُدھر نکلا اور پھر ڈوبا تو نکلا ہی نہیں''

عمران کے بارے میں میرا وہ شک پختہ یقین میں بدل گیا کہ وہ اس سفر پر صرف اس لیے آیا ہے کہ میری زندگی کے آخری لمحوں کو قلم بند کرنے کا اعزاز حاصل کر سکے..

عمران وہ پتھر دل کیمرہ مین تھا جو رابرٹ کینیڈی کے سر میں گولی لگنے کے بعد اسے طبی امداد دینے کی بجائے کیمرہ اس کے پھٹے ہوئے بھیجے پر جمائے اس کے مرنے کا منظر محفوظ کرنے میں محو تھا اور جب اُس کی بیوی احتجاج دوہائی دیتی ہے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو تو وہ کہتا ہے ''لیڈی دس از ہسٹری..''

تو اب عمران اس قسم کی ہسٹری ریکارڈ کرنے کا متمنائی تھا اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہ تھا کہ میں ہسٹری کے آگے ہتھیار ڈال دوں..اس آتش آب میں کود پڑوں جس کے گل وگلزار ہو جانے کا کوئی چانس نہ تھا..

مجھے بہر طور اولین شہید آب ہونا تھا..

''چلیں سر جی..لائٹ بھی کم ہو رہی ہے..آپ بھی تو سوہنی کے دیس کے ہیں جو کچے گھڑے کے ساتھ چناب میں اُتر گئی تھی''

''لیکن یہاں تو کچا گھڑا بھی نہیں ہے''

''اور آپ بھی تو سوہنی نہیں..چلیے سر جی ٹیسٹ اور ٹائم ضائع نہ کریں''

یہ شام تھی..اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو پانیوں کی جھاگ کی سفیدی تھی..یا موت تھی..میں اپنی جین سنبھالتا ایک پورٹر کا سہارا لیتا بڑی مشکل سے بلند کنارے سے نیچے اُترا اور پانیوں کی بوچھاڑ کی قربت میں ہوا..پھر نالے کو جانچا..کہاں کہاں اس کے پانیوں میں پتھر دکھائی دیتے ہیں..کہاں وہ قدرے اطمینان سے بہتے ہیں اور کہاں ایسے گرداب گھومتے ہیں جو مجھے نگل سکتے ہیں..

نالے کی بے لگام بوچھاڑوں میں کبھی کبھار کوئی مقامی کسان تیرتا..اُبھرتا..پتھروں کو پھلانگتا پار چلا جاتا..ان لوگوں کو دراصل گر کر سنبھل جانا آتا تھا..

میں نے ایک بار شیش گڈریے کو دیکھا کہ وہ اپنی بکری کو پار لے جانے کی کوشش کر رہا ہے..بکری کے پاؤں فوراً اکھڑتے اور وہ اس کے گلے سے بندھی ہوئی رسی اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے پانی سے باہر گھسیٹ لیتا..دو تین بار ایسا ہی ہوا تو بکری نے عقل سلیم استعمال کرتے ہوئے نالے میں پھر سے اُترنے سے انکار کر دیا..وہ لاکھ رسی کھینچنے سے بھی پانیوں کے قریب نہ آتی تھی..

اس نے چاروں ٹانگوں کو بیک گیئر لگا رکھا تھا..تب گڈریے نے جیب میں سے ایک دھجی برآمد کر کے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی..یہ طریقہ آزمودہ تھا..بکری پانی میں اُتر گئی..کبھی وہ گڈریا گرتا اور کبھی بکری پانی میں ڈوب جاتی..لیکن وہ پار ہو گئے..

لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی باندھنے والا بھی کوئی نہ تھا..

میرے ساتھی کناروں پر کھڑے..میرے لیے تشویش میں کھڑے تھے اور عمران کے کیمرے کی آنکھ مجھے زُوم اِن کر رہی تھی..

میں نے بسم اللہ پڑھ کر..اپنے بچوں کو یاد کر کے نالے میں پہلا قدم رکھا اور یہ میری توقع کے عین مطابق تھا..یہ پانی نہیں تھے بھونکتے ہوئے پاگل کتے تھے جو میری ٹانگوں کو جھنجھوڑتے تھے..میں نے ایک پورٹر کی بانہوں کا سہارا بھی لے رکھا تھا..میں ایک بار بڑی طرح لڑکھڑایا پھر سنبھل گیا..میں ان پتھروں کو نظر میں رکھتا تھا جو کبھی کبھار پانی میں سے اُبھرتے ننگے ہو جاتے تھے..مجھے وہاں تک پہنچنا تھا اور پھر کسی اور پتھر کی تلاش میں..اب اس کی تفصیل میں کیا جانا کہ جان سے جاتے ہوئے، پار جاتے ہوئے ہم پہ کیا گزری..جو ہم پہ گزری سو گزری..لیکن ایک اقرار میں بہر طور کروں گا..کہ اس جان لیوا آبی پارگی کے دوران بھی میرے اندر کا مرا ہوا اداکار ہوشیار تھا..اور ہر لمحے اسے احساس تھا کہ اسے شوٹ کیا جا رہا ہے اور وہ صرف شاٹ کے لیے ایک جعلی بہادری اور بظاہر نڈر خصلت کا مظاہرہ کر رہا تھا..اگر میں ڈوب جاتا تو بھی یہ طے ہے کہ میں آخری بار سطح آب سے باہر آتے ہوئے کیمرے کی جانب ہاتھ لہرا کر مرتے ہوئے لبوں پر ایک مسکراہٹ سجا کر ''ہیلو'' ضرور کہتا..یہ ایک متروک اداکار کی مجبوری تھی..

دوسرے کنارے پر متعدد ہاتھ تھے جنہوں نے مجھے باہر گھسیٹ لیا..

اگرچہ شعلۂ عشق کو میرے بعد سیاہ پوش ہو جانا چاہیے تھا..یعنی شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے..لیکن میری حیات کی شمع نالے کے پانیوں سے گل نہ ہوئی تو میرے ساتھی بھی نالے میں قدم دھرنے لگے..

میں نالے کے دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنے جوگرز اُتار کر..جرابیں اُتار کر انہیں نچوڑ رہا تھا لیکن پانیوں کی برف سردی میرے پورے بدن کو بھگو کر اسے ٹھٹھرنے پر مجبور کر رہی تھی..مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں پار آ گیا ہوں..

''ملتر جھیلیں جوہڑ جھیلیں.. اور میری شان میں گدھے کا راگ درباری''

اب شام رخصت ہوا چاہتی تھی اور تاریکی پر تولتی تھی..

گوجروں کے کچھ جھونپڑے تھے.. آلو کے کھیت تھے اور ایک گھنا جنگل تھا..

کسی ایک جھونپڑے میں پہلا دیا روشن ہوا..

ہم ابھی تک بھیگے ہوئے.. ٹھٹھرتے ہوئے.. جھیلوں کی آس میں بھٹکتے ہوئے چلتے تھے.. پھر ایک پل آیا..

پل کے پار درختوں کا ایک گھنا ذخیرہ تھا جس میں گوجروں کے چند جھونپڑے تھے.. گائیڈ بکس میں اس مقام کا نام ''بنگلہ'' ہے..

ہم ان کے قریب سے ہو کر جنگل میں بھٹکتے چلتے.. تھکاوٹ سے اور سردی سے اور پانی سے شرابور چلتے ذرا کھلی فضا میں آئے جہاں دو ندیاں بہتی تھیں.. جو بے حد پُرسکون اور ہموار تھیں..

ہم بے پرواہ ہو کر ان میں سے مزید سرد اور ٹھنڈے ہوتے گزر گئے اور تب جا کر جب شام کے بعد رات ہو چلی تھی اندھیرے میں ایک ٹیلا نظر آیا.. ہم اس پر قدم گھسیٹتے.. بیزار.. ایک دوسرے کے وجود سے غافل.. اپنی اپنی تھکاوٹ میں چُور اس ٹیلے پر چڑھے تو ایک پورٹر نے کہا ''صاحب جھیل آ گیا ہے..''

''کہاں آ گیا ہے؟'' میں نے اپنے سامنے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ نہ کچھ دیکھنے کی جستجو کی اور وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا..

''صاحب رات کے اس ٹیم کیسے نظر آئے گا.. دن کو نظر آئے گا.. لیکن جھیل آ گیا ہے''

سامنے ایک موہوم اور اندھیاری سی.. بجھی ہوئی شائد کوئی تصویر تھی یا نہیں تھی.. یا ایک واہمہ تھی.. ایک جوہڑ نما علاقے کی تھی..

ہم جھیلوں کے ماہر تھے.. ایکسپرٹ تھے.. دور سے جان جاتے تھے کہ جھیل کیسی ہے.. اس کی خصلت میں کیا ہے.. اس میں اترنے سے خنکی اور ناپسندیدگی کا احساس ہوگا یا آپ کے بدن کے لمس سے اس کے پانی یکدم بڑھ جائیں گے اور آسودگی دینے والے ہو جائیں گے.. اور چھپاک چھپاک کی مسرت آمیز آہوں سے وہ آپ کا استقبال کرے گی..

لیکن ہم جھیلوں کے ماہر آج مات کھا گئے تھے..

ملتر کی جھیلیں اس تاریکی میں جیسی بھی دکھائی دے رہی تھیں کچھ اچھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں.. بس جوہڑ دکھائی دے رہی تھیں.. ہم ٹیلے سے نیچے اترے تو پانی کی قربت کا احساس ہوا جسے ہم دیکھ نہیں سکتے تھے چٹانوں کی اوٹ میں ہمارے خیمے نصب ہو چکے تھے اور ایک لالٹین روشن تھی.. خیمہ گاہ کچھ بے کشش سی لگتی تھی لیکن ہم اس سے خوبصورتی کے نہیں خوراک کے تمنائی تھے.. میں نے ابراہیم یعنی ہمارے آفیشل کک کو طلب کیا ''آپ نے ہمارے لیے کھانا تیار کر لیا ہے؟''

اور ابراہیم نہایت معصومیت سے کہتا ہے.. نہیں صاحب.. میں آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ آئیں اور بتائیں کہ کیا بنانا ہے..

''یار کچھ بھی بنا لو.. بس گرم ہو اور بہت ہو.. کتنی دیر میں بنا لو گے..''

''دو تین گھنٹے میں تیار کر لیں گے صاحب..''

''دو تین گھنٹے میں تو ہم فوت ہو جائیں گے ابراہیم'' سلیم بولا..

''تو پھر ڈھائی گھنٹے میں بنا لیں گے آپ آرڈر کرو''

میں اپنے خیمے میں جا گرا.. میری رانیں خراشوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان میں سے خون رستا تھا.. میں اُن حضرات کو کوس رہا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ملتر جھیلیں تو محض تین گھنٹے کی آسان اور گنگناتی ہوئی مسافت پر ہیں.. سردی تھی اور میرے بھیگے ہوئے جوگرز پاؤں کو برف کر رہے تھے.. میں انہیں اتارنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ تھی..

خیمہ گاہ چند بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں تھی.. جھیل کنارے نہ تھی..

جونہی میرے بدنی حالات سنبھلے میں نے جوگرز اتار کر انہیں نچوڑا.. پھر جرابیں کھینچ کر

انہیں نچوڑا اور خیمے سے باہر پھینک دیا.. اور ایک مرتبہ پھر ابراہیم کو طلب کر لیا ''تم نے کچھ پکانا شروع کیا ہے؟''

''صاحب آپ نے ابھی تک آرڈر ہی نہیں دیا.. ویسے چولہا جلا لیا ہے''

''خدا کے واسطے کچھ بھی بنا لو.. کیا بناؤ گے؟''

''بریانی بنائے گا.. قورمہ کا ڈبہ کھولے گا.. پراٹھے کھلائے گا.. مرغی مصالحہ بنائے گا''

''سب کچھ بنا لو..'' میرے منہ میں پانی آنے لگا..

''سب کچھ بناؤں گا تو صبح ہو جائے گی صاحب..''

''تو پھر..''

''آلو شوربہ بنا لیتا ہوں.. بس دو گھنٹے میں تیار ہو جائے گا..'' وہ جانے لگا..

''سنو ابراہیم.. ادھر پتھروں کے درمیان کیوں کیمپ کر لیا ہے.. جھیل کنارے خیمے کیوں نہیں لگائے؟''

''ادھر گھاس ہے.. ولدل ہے اور رات کو قلفی جمتا ہے بہت ٹھنڈی ہوا چلتا ہے.. ادھر پتھروں کے درمیان ہوا سے بچاؤ ہو گا.. گورا لوگ بھی ادھر کیمپ کرتا ہے..''

ایک تو شمال میں ان گورا لوگوں کے حوالوں سے بہت تنگ آیا ہوا تھا.. پورٹر.. گائیڈ باورچی سب لوگ بات بے بات پر گورا لوگ کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے.. گورا لوگ تو ہمیں لوٹ دیتا ہے.. گورا لوگ تو اُبلی ہوئی سبزی کھاتا ہے اور آپ روز پلاؤ پراٹھا مانگتا ہے.. گورا لوگ تو ٹائلٹ جاتا ہے تو پیپر استعمال کرتا ہے آپ کہتا ہے کہ لوٹے میں گرم پانی لاؤ نہیں تو نیچے سے قلفی ہو جائے گا.. اور گورا لوگ کے ساتھ گوری لوگ ہوتا ہے اور آپ کے ساتھ میاں صاحب ہے..

''لیکن ابراہیم ہم تو جھیل دیکھنا چاہتے تھے..''

''تو صبح اُٹھ کر دیکھ لینا.. اب دیکھ کر کیا کرے گا.. نظر بھی نہیں آئے گا..''

''ٹھیک ہے تم آلو شوربہ تیار کرو..''

گئی رات ابراہیم کی یہ خصوصی ڈش ترپال بچھا کر پیش کی گئی.. درمیان میں لکڑیاں سلگائی گئی تھیں جنہیں الاؤ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے.. چنانچہ ہمارے چہرے تو آگ کی حدت سے آسودہ ہوتے تھے لیکن ہماری پشتیں بقول ابراہیم قلفی ہوتی تھیں.. آلو شوربے میں روٹی بھگوتے تو لگتا جھیل کے پانیوں میں ہاتھ ڈال دیا ہے.. ٹھنڈا اور چپا چپنگ.. اور آلو پتھر کے موافق..

''سر جی یہ عشق کیا چیز ہے؟'' سلیم نے شوربے کی پلیٹ کو منہ سے لگا کر تر چھا کیا اور ڈیک لگا کر پی گیا.. پھر مونچھیں پونچھیں اور پھر پوچھا..

''تمہیں ہو گیا ہے؟''

''نہیں''

''تو پوچھتے کیوں ہو؟''

''تاکہ جب ہو تو پتہ چل جائے کہ ہو گیا ہے..''

عجیب مسخرہ شخص تھا..

خیمے میں جانے سے پیشتر میں الاؤ سے پرے ایک بڑے پتھر تک گیا جس کے عقب میں جھیل کی شنید تھی.. وہاں ٹھہرے ہوئے بساند دیتے پانیوں کا شائبہ سا تھا.. اور اس کا حجم بھی زیادہ نہ لگتا تھا.. وہی گاؤں کے کسی عام سے جوہڑ کے سائز کا.. اسی لیے میں نے آج تک کسی کو وہ نور دکو ان جھیلوں کے بارے میں پُرجوش ہوتے نہیں سنا تھا.. اور نہ کبھی ان کی کوئی قابلِ ذکر تصویر دیکھی تھی.. میں واپس ہوا الاؤ کی روشنی کو نظر میں رکھتا احتیاط سے قدم رکھتا خیمہ گاہ میں واپس آیا اور اپنے خیمے میں جا لیٹا.. پھر احساس ہوا کہ سلیپنگ بیگ کے اوپر پڑا ہوں.. اس کی زپ کھولی اور اس کے اندر دکھتے بدن کو سرکاتا گھس گیا.. میں پورے ایک برس بعد اپنے کمرے سے نکل کر ایک خیمے کی آوارہ گردآزادی میں رات کرنے کو تھا لیکن آج شب میں کوئی ہیجان کوئی خوش بختی محسوس نہیں کر رہا تھا.. ایک تو اس بار بھانت بھانت یعنی میں نے ایک عجیب سا کنبہ جمع کر لیا تھا.. میں، شاہد، میاں اور سلیم ایک گروپ تھے.. عمران، طاہر اور کاظمی ایک الگ فرقہ تھے اور گدا اور گردآ میز کی جوڑی بھی کیا رب نے بنائی تھی.. اور سب لوگ الگ الگ اپنے گروپ، فرقے اور جوڑے میں مگن چلتے تھے.. مصروفیات مختلف تھیں اور آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا.. علتر میں لیڈر نے بھی کچھ عارضی بدمزگی پیدا کر دی تھی، فیری میڈو کے بعد وادی کلتر بھی کچھ پھیکی پھیکی لگ رہی تھی اور سونے پر سہاگہ وہ کمبخت غیر متوقع نالہ تھا.. اور ان سب کا نکتہ عروج آلو شوربہ اور جوہڑ جھیلیں تھیں..

لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ نکتہ عروج تو ابھی آنے کو ہے.. اور اسی شب آنے کو ہے..

میں اپنی خون آلود خراشوں کو سہلاتا ایک حاملہ عورت کی مانند ٹانگیں چوڑی کیے ابھی نیند کی وادی میں اُترنے کی آرزو اور کوشش میں تھا کہ میرے خیمے کے پردے کے عین اوپر ایک ہلکی سی خرخراہٹ ہوئی جو کسی خرکی تھی اور پھر اس خرخراہٹ کے تسلسل میں پہلے ایک زوردار دھمک ہوئی

پھر وہ ڈھینچوں ہوئی اور یوں جگر سوز اور دلدوز اور بہت ہی بلند ہوئی کہ خیمے کے پردے لرزنے لگے..اس کے ساتھ میرے کانوں کے پردے بھی لرزنے لگے..یہ ڈھینچوں ڈھینچوں اتنی بلند والیوم میں تھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس خر غلط نے جاپان سے خصوصی طور پر کوئی ہائی فائی ساؤنڈ سسٹم امپورٹ کیا ہے اُس کے کم از کم چھ سپیکر میرے خیمے کے گرد نصب کیے ہیں اور پھر مائک میں تھوتھنی گھسا کر آہ و فغاں کا یہ سلسلہ صد آ زار شروع کر دیا ہے..میں نے تحمل سے کام لیا.اپنے آپ پر جبر کیا اور صبر کیا اس خیال سے کہ بلندی کی وجہ سے ہماری طرح اس گدھے کا سانس بھی تھوڑی دیر میں پھول جائے گا لیکن یہ وہی خیال تھا جسے خام کہتے ہیں..وہ نیک جانور بے تکان اور ایک عجیب عالم بے خودی میں اس الاپ میں مصروف رہا.صرف ایک بار کچھ توقف کیا اور جتنی دیر میں میں نے سلیپنگ بیگ میں سے سر نکال کر اطمینان کا ایک سانس لیا اتنی دیر میں وہ پھر فن کی بلندیوں کو چھونے لگا..میں کہاں تک صبر کرتا..مجھے ابھی تک کسی بھی پورٹر کا نام یاد نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے پھر ''ابراہیم ابراہیم'' کی دوہائی دی..یہ دوہائی متعدد بار دی گئی کیونکہ گدھے کے سُر سے اونچا سُر لگانے کے لیے ایک اور گدھا ہونا ضروری تھا..

ابراہیم ابھی کھانے کے برتن سمیٹ رہا تھا..وہ فوری طور پر خیمے کے باہر حاضر ہو گیا اور چیخ کر پوچھا ''کیا ہے صاحب؟''

''یہ گدھا کس کا ہے..''

''ہمارا اپنا ہے سر..''

''لیکن ہمارے ساتھ تو میاں ،شاہد..گرد آمیز اور گدا وغیرہ آئے ہیں ،گدھا کہاں سے آ گیا..''

''ٹیم ممبر ہے سر..''

''یہ سلیم تو نہیں ہو سکتا وہ تو میرے برابر میں خراٹے لے رہا ہے اور اُس کی مونچھیں پھڑک رہی ہیں..شاہد ہے؟''

''نہیں صاحب..'' ابراہیم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں'' یہ تو پورٹر گدھا ہے سر..''

''میں نے تو کسی گدھے کو پورٹر کے طور پر ہائر نہیں کیا''

''لیکن صاحب آپ نے جس امین پورٹر کو ہائر کیا ہے یہ اس کا گدھا ہے..جو بوجھ اٹھا

کر چلتا ہے اور وہ اسے ہانکتا ہے''

''درست..تو یہ رات کے اس پہر کیوں بولتا ہے؟'' ''اور اس طرح کیوں بولتا ہے؟''

''گدھا تو اسی موافق بولے گا سر..''

''یہ چپ نہیں ہو گا؟''

''نہیں..''

''کیوں؟''

''اس کا مرضی ہے صاحب..''

میں سلیپنگ بیگ سے اُلجھتا..غصے سے سلگتا اور اُبلتا..سردی میں ٹھٹھرتا خیمے سے باہر آ گیا'' اس کے ساتھ جو پورٹر ہے امین..تو وہ کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر پتھروں کے نیچے مزے سے سوتا ہے سر..''

''تو اسے کہو کہ اپنے اس گدھے کو فوری طور پر میرے خیمے سے کہیں دور لے جائے..''

''کہاں لے جائے گا سر..گدھا تو اِدھر ہی رہے گا..ٹیم ممبر ہے''

''کہیں بھی لے جائے..بے شک جھیل میں ڈبو دے..لیکن یہاں سے لے جائے..نہیں لے جائے گا تو اس کو مزدوری نہیں ملے گا..

''آپ کو ایک اور گدھا بھی نہیں ملے گا صاحب..وہ پورٹر کا سامان اٹھاتا ہے''

''تم بحث کیوں کرتے ہو ابراہیم..کیوں کرتے ہو''..میں چونکہ تقریباً چیخ رہا تھا اس لیے بقیہ خیموں میں نیم خوابیدہ ٹیم ممبران بھی بیدار ہو گئے اور بجائے اس کے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے جگتیں کرنے لگے..مجھ پر پھبتیاں کسنے لگے..

''مائی لیڈر..'' یہ شاہد کی آواز تھی ''ہمیں تو آپ بولنے نہیں دیتے گدھے کو تو بولنے دیں''

فوری طور پر میاں صاحب نے شاہد کا ساتھ دیا'' تارڑ صاحب..گدھے کا پتہ نہیں کیا پرابلم ہے..ذرا رومینٹک ہو رہا ہے تو اس کی مجبوری ہو گی..آپ غصہ کیوں کرتے ہیں''

''یار یہ تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہا؟''

''نہیں..'' دونوں نے کورس میں جواب دیا.

اس دوران عمران بھی اپنے خیمے میں سے بولا..اور ایسے بولا جیسے خواب میں بول رہا ہو..رُک رُک کر..اور آسودگی میں گم بولا..وہ تینوں آج کی تھکن کا مداوا دھویں سے کر رہے تھے..

انہیں گدھے کی آواز بھی سُریلی لگ رہی تھی'' سر جی.. گدھے کو پرفارم کرنے دیں.. ذرا ہمدردی سے سنیں.. خود کو اس کی جگہ رکھ کر سنیں.. نہایت سُریلا ڈکی ہے.. کیا میوزک ہے سر.. جھیل غلتر کے کناروں پر گویا سمفنی ہے.. آپ ذرا ہمدردی سے سُنیں..''

ویسے ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جتنی دیر میں ابراہیم سے گفت وشنید کرتا.. یا ٹیم ممبران مجھ پر فقرے بازی کرتے رہتے گدھا بالکل خاموشی اختیار کر لیتا اور جونہی گفتگو میں وقفہ آتا وہ طویل النفس بے چین روح اپنی کسی بے وفا محبوبہ کے فراق میں شائد نہایت جگر شگاف ڈھینچوں ڈھینچوں کا سلسلہ کلام پھر سے شروع کر دیتا..

''ابراہیم..'' میں پھر گرجا..

''سر میں امین کو جگاتا ہوں اور اس کو بولتا ہوں کہ اپنے گدھے کا کچھ کرے....'' ابراہیم اس پتھر کی جانب چلا گیا جہاں سردی سے لاپرواہ ہمارے پورٹر بوسیدہ کمبلوں اور پرانی جیکٹوں میں ننگے پاؤں گچھا مچھا ہو کر گہری نیند میں تھے.. تھوڑی دیر بعد گدھے کا مالک امین آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا.. ازار بند اُڑستا اور بیزار شکل کے ساتھ نمودار ہوا اور اپنے اس عزیز کے ایک لمبے کان کو گرفت میں لے کر اسے ایک جانب لے گیا.. خیمہ گاہ سے کہیں دور لے گیا لیکن جہاں بھی لے گیا وہاں سے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے پھر راگ درباری الاپنا شروع کر دیا.... اگرچہ اب دوری کے باعث اس کا ساؤنڈ سسٹم نسبتاً کمزور پڑ چکا تھا.. بالآخر میں نے اسے ایک لوری سمجھ کر قبول کر لیا اور اونگھنے لگا.. بلکہ گدھے کی دور سے آتی ہوئی فراق آمیز آواز میں وقفہ ہوتا تو میری آنکھ کھل جاتی.. یعنی شب بھر باجے باجتے رہے..

''غلتر جھیلیں.. شیشے کا ایک شہر.. آبی جادوگری کے گُل رنگ انار.. ایک طلسم ہوش رُبا''

شمال میں کوہ نوردیوں کے دوران اگر آپ رات گئے تھکے ہارے کسی منزل پر پہنچتے ہیں، خیمے نصب کر کے شب گزارتے ہیں تو اکثر اوقات اگلی سویر حیرانی کی ہوتی ہے.. آپ اپنے آپ کو ایک حقیقی طور پر مختلف جگہ پر پاتے ہیں.. اور ہمیشہ حیران ہوتے ہیں کہ کیا یہ وہی مقام ہے جہاں پچھلی شب میں آیا تھا.. اس لیے کہ اندھیرے کے باعث جو منظر لالٹین کی روشنی میں محدود اور مختصر ہوتا ہے وہ دن کی روشنی میں پھیل جاتا ہے.. سفر کی تھکاوٹ کم ہو چکی ہوتی ہے اور بینائی بڑھ جاتی ہے..

اگلی سویر.. وادی غلتر میں پہلی شب گزارنے کے بعد میں خیمے سے باہر آیا تو یہی کیفیت تھی.. ہماری خیمہ گاہ تو خاصی خوش نظر تھی.. کناروں پر چند چٹانیں تھیں.. پتھروں کی ایک فصیل کے اندر ایک ہموار جگہ روپوش تھی جہاں ہمارے خیمے تھے اور اردگرد دور دیوار پر سبزہ اُگ رہا تھا.. کچھ درخت تھے.. جھاڑیاں اور گھنی گھاس اور کہیں بیلیں لٹکتی تھیں اور جو سویر کی ہوا تھی اس میں ایک نم آلود.. ستھری سرد مہک تھی جو ہمارے آس پاس تیرتی تھی اور اس میں سانس نہیں وہ نایاب انعام تھا جو صرف کوہ نوردوں کی قسمت میں ہوتا ہے..

ہمارا پرسنل گدھا بھی کب کا شانت ہو چکا تھا..

ابراہیم بڑے پتھر کی اوٹ میں ایک دھواں دار چولہا جلائے پراٹھے تل رہا تھا جن کی مست مہک آلو شوربے سے عاجز آئے ہوئے ہمارے بدن کے اندر باران رحمت کی مانند برستی

دھوم مچاتی تھی..

میں نے اپنی شیونگ کِٹ سنبھالی.. برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر ابراہیم کو پکارا "یار لوٹے میں گرم پانی لے کر آؤ.. صاحب شیو کرے گا.. برش کرے گا"

ابراہیم نے میری پکار پر دھیان نہیں دیا پراٹھے پر دھیان دیا اور بے رُخی سے بولا "صاحب.. اُس پتھر کے پار چلے جاؤ.. درختوں کے پیچھے.. وہاں دنیا بھر کا پانی ہے.. زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے.."

میں اپنے سلیپر گھسیٹتا.. برش پر جمی ٹوتھ پیسٹ کو بیلنس کرتا.. درختوں کے پیچھے گیا جہاں دن کی روشنی نے منظر کو وسیع کر دیا تھا اور وہاں دنیا بھر کا پانی تھا..

اگرچہ وہاں دنیا بھر کے پانی تھے لیکن دنیا بھر میں ایسے پانی کہیں اور نہیں ہو سکتے تھے.. ایسے ملتر جھیلوں کے پانی تھے..

میں اپنے سلیپر گھسیٹتا، برش پر جمی ٹوتھ پیسٹ بیلنس کرتا درختوں کے پیچھے گیا ہوں تو ایک اور دنیا میں چلا گیا ہوں.. سویر کی ہلکی دھوپ میں ملتر جھیلوں کے پانی تھے جن میں میں چلا گیا ہوں.. وہ دکھائی ہی نہیں دیتے تھے کہ اتنے شفاف تھے.. دکھائی نہیں دیئے تبھی تو میں رُکا نہیں ان کے اندر چلا گیا ہوں..

یہ آبی جادوگری کا ایک شہر تھا جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا.. پانی کے سوا ہر شے دکھائی دیتی تھی..

شیشے کا ایک شہر تھا اور دکھائی نہیں دیتا تھا اتنا شفاف تھا..

یہ اس ساحر کے سحر سے وجود میں آیا تھا اور میں آنکھیں نہیں جھپکتا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ میری پلکوں کی زد میں آیا تو یہ گیا.. کرچی کرچی ہوا..

میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے اٹھا ہوں تو اس طلسم ہوش ربا میں داخل ہو گیا ہوں اور اب آنکھیں نہیں جھپکتا کہ یہ ٹوٹ نہ جائے..

یہ پانی نہ تھے.. شیشہ گری کا شفاف کام تھا جس کی تہہ میں پڑے برچ کے درختوں کے سفید تنے زندہ لگتے تھے.. اس میں سبز کائی کے پھریرے ہولے ہولے سرسراتے تھے کہ وہ تہہ میں سے پھوٹنے والے چشموں کی زد میں آتے تھے اور ہولے ہولے سرسراتے تھے.... جہاں کہیں کوئی چشمہ پھوٹتا تھا وہاں وہ شیشہ آب میں ایک گل رنگ انار کی طرح پھوٹتا تھا، رنگوں کی پھلجھڑیاں اس

شیشے کے شفاف بدن میں شب برات کرتی تھیں.. چشموں کی نیلاہٹ کے نیل شیشہ پانیوں میں دھیرے دھیرے سرگوشیاں کرتے تھے.. اور سب کچھ دکھائی دیتا تھا سوائے پانیوں کے جن کی شفافی اُنہیں شیشہ کرتی تھی..

ٹیڑھے میڑھے کناروں پر گھاس کے کناروں پر کہیں برچ کے درخت پانیوں میں اوندھے پڑے تھے اور کہیں ان پر جھکے ہوئے تھے..

یہ ایک جہان شیشہ گری تھا.. میں سانس بھی آہستہ لیتا تھا کہ نازک ہے بہت کام.. میں نے زندگی بھر ایسے طلسم خیز نتھرے اور آر پار شفاف پانی کہیں نہیں دیکھے تھے..

میں اپنے ٹوتھ برش کو ایک فاترالعقل شخص کی مانند تھامے.. منہ کھولے.. ملتر جھیل کو تکتا جا رہا تھا کہ جھیلیں ایسی تو نہیں ہوتیں..

وہ شاندار ہوتی ہیں برف پوش پہاڑوں میں گھری پیالہ سیف الملوک ہوتی ہیں.. رنگ بدلتی سونے کے ذرّوں والے چشموں کے کنارے صد پارہ ہوتی ہیں..

کوئی کرومبر ہوتی ہیں جو سردیوں میں منجمد ہوتی ہیں تو ان پر یاکوں کے قافلے چلتے ہیں..

خشک پہاڑوں میں گھری حنا ہوتی ہیں اور کینجھر ہوتی ہیں جن پر دور دیسوں کے پرندے اُترتے ہیں..

مگر ایسی نہیں ہوتیں جیسی یہ ملتر جھیل تھی..

میں جو اپنے تئیں جھیلوں کا ماہر تھا یہاں مار کھا گیا تھا.. اپنی نادانی میں شب کی تاریکی میں اسے جوہڑ سمجھ بیٹھا تھا اور اس نے مجھے برباد کر دیا تھا.. یہ تو رینائر اور وان گوگ کے برش سے وجود میں آنے والی شوخ تازہ رنگوں کی تصویر تھی جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا سوائے پانی کے..

یہ قطعی مبالغہ نہیں کہ اس کے پانی اتنے شفاف اور شیشہ تھے کہ سویر کی دھوپ میں بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے.. صرف اس کی تہہ میں سے جو چشمے اُبل رہے تھے اُن کے بلبلوں کے اُٹھنے سے ان شیشوں میں عارضی دراڑیں پڑتی تھیں.. اور جو نیلاہٹ اس کی تہہ میں چھپی تھی وہ نیلاہٹ نہیں نری حیرت تھی.. جہاں کہیں تہہ میں سے پھوٹنے والے پانی زور کرتے تھے وہاں سبز کائی ان کی زد میں آ کر سرسراتی اور زندہ ہوتی لگتی تھی..

گہرائی زیادہ نہیں تھی.. لیکن اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے پانیوں میں گرے ہوئے برچ کے تنے.. شاخوں کے انبار.. کائی کے مختلف سبز بھی اور بھورے رنگ.. پتے اور کچھ

کنکریاں عریاں تھے جیسے ان کے اوپر پانی نہیں صرف خلاء ہے.. میں آپ کو اس طلسم میں یوں شامل کرتا ہوں کہ ذرا میرے ساتھ دیکھئے.. سطح آب پر سویر کی ہلکی روشنی میں ایک خزاں رسیدہ تانبے کے رنگ کا پتہ ہے جو ہوا کے زور سے ہولے ہولے حرکت کرتا ہے کہ پانی تو سکوت میں ہے.. اب سطح آب سے نیچے جھیل کی تہہ کو دیکھئے.. اس پتے کے عین نیچے جھیل کی تہہ میں اس کا سایہ اسی مدھم رفتار سے ہولے ہولے آگے ہوتا ہے..

اسے ایک باقاعدہ جھیل نہیں کہا جا سکتا تھا..

اس کا کوئی باقاعدہ حدود اربعہ نہیں تھا..

یہ خاصی بے ترتیب تھی..

محض پانیوں کا ایک ساکن ذخیرہ تھی..

چند ٹیلے تھے جن کے اندر یہ پانی بھرے ہوئے تھے.. اس کے دوسرے کنارے پر بھی جو دور نہ تھا.. برچ کے کیڑے.. کچھ زندہ کچھ خشک ہو چکے سفید درخت جھکے ہوئے تھے.. کچھ اس کے پانیوں میں گرے ہوئے تھے اور ان کی سفید شکلیں تہہ میں ڈوبی مدھم نہ ہوتی تھیں.. میں قطعی طور پر پچھلی شب اس جھیل کو جوہڑ خیال کرنے پر شرمندہ نہ تھا.. شرمندگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

ایسے شیشہ پانی.. کائی کے سبز اور بھورے.. اور نیلے اور گوڑھے رنگ میں نے آج تک کسی بھی جھیل میں نہیں دیکھے تھے..

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ جھیل نہیں تھی.. یہ ایک جھیل کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی.. یہ ایک شعبدہ تھا.. شیشہ گری اور حیرت گری کے رنگوں کی ایسی نگری تھی جو صرف جادوئی داستانوں اور قصوں میں ہی جنم لیتی ہے..

یہ کہیں دکھائی نہیں دیتی.. صرف اس کا تخیل پرواز کرتا ہوا اسے کوہ قاف تک لے جاتا ہے اور پھر بھی اسے سچ مچ اپنے سامنے پا کر وہ تخیل بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے..

میں ابھی تک اس سحر کے سناٹے میں آیا ہوا اسی خزاں رسیدہ پتے کو تکتا تھا جو سطح آب پر ہوا کی نامعلوم زد میں آ کر ہولے ہولے سرکتا تھا اور اس کے نیچے کئی فٹ نیچے اس کا سایہ جھیل کی تہہ میں حرکت کرتا تھا..

اگرچہ اس آسمانوں سے اتری ہوئی شیشہ نگری میں اپنا ٹوتھ برش ڈبو کر دانت مانجھنا اور پھر سیفٹی ریزر اس کے پانیوں میں تر کر کے شیو بنانا اور کلیاں کرنا توہین جھیل تھی.. لیکن ادھر اس کی

کوئی سزا نہ تھی، کوئی فتویٰ نہ تھا اس لیے میں نے مجبوراً ایسا کیا..

میں برش کو جھیل میں اتارتا تو وہ پانی کے آر پار دکھائی دیتا رہتا.. اگر میں اپنا ہاتھ ڈبوتا تو وہ بھی ایک مائیکل انجلو کے تراشیدہ ہاتھ کی مانند پوری تفصیل سے دکھائی دیتا رہتا..

دھوپ کے قدرے تیز ہونے سے.. یہ پانی تو بالکل ہی شیشہ ہو کر نظر سے اوجھل ہو رہے تھے اور تہہ کے بوٹے اور کائی رنگ نکھارتے آپ کے لبوں تک آتے تھے.. یہ اگرچہ شیشہ پانی تھے لیکن ان پر جھکنے سے چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا.. تہہ میں جو جہان رنگ و بو تھا وہ نظر آنے لگتا تھا..

ایسا ہوا اور اکثر ہوا کہ میں نے کسی موڑ پر.. کوہ نوردیوں کے کسی موڑ پر.. کوئی بدن میں سنسنی اور تشکر بھر دینے والا منظر یکدم دیکھا تو میں نے آوارگی جو دیوانگی عطا کرتی ہے اس سے مغلوب ہو کر کبھی ''یا ہو'' قسم کا بیہودہ نعرہ بلند کیا اور کبھی اس منظر کو ہاتھ ہلا کر ''ہیلو'' کہا.. یا انگلیوں کو لبوں پر رکھ کر ''آئی لو یو'' کی سرگوشی کی.. اور کبھی ''سبحان اللہ'' کہا.. اور اکثر چپ بھی ہوا.. یہاں میں چپ نہیں رہنا چاہتا تھا.. کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہا کیونکہ کچھ بھی کہنے سے منظر ٹوٹتا تھا..

''شیشۂ آب پر ایک کنکر..ایک پتہ اور ایک رنگین مچھلی''

مجھے اپنے آپ پر تو اختیار تھا لیکن میں عمران کا کیا کرتا کہ اس نے کچھ لحاظ نہ کیا اور منظر کو توڑ دیا'' واہ تارڑ صاحب..کیا اور جنل اور نیچرل شاٹ دیا ہے آپ نے..'' وہ اپنے بغلی بچوں سمیت..آلات فلم بندی سمیت..کیبل کھینچتا..اپنے دور بین نما لینز سنبھالتا..ٹیکر ٹوٹتا..داڑھی کھجاتا بڑے پتھر کے عقب میں سے ایک ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوا اور منظر کو برباد کر دیا'' سر میں نے ادھر چھپ کر آپ کو علتر جھیل کنارے ٹوتھ برش کرتے..شیو بناتے شوٹ کیا ہے..قسم سے کیا موازنہ ہوا ہے آسمانی خوبصورتی کا اور زمینی بدصورتی کا..''

یہ عمران کی ذی ہوشی کے آخری فقرے تھے..انہیں ادا کرنے کے فوراً بعد اس نے کیمرہ زمین پر رکھا..دیگر آلات فلم بندی کو گلے سے الگ کیا اور جھیل کنارے لیٹ کر پھر سے'' ہائے اللہ جی..میں آپ سے نہیں بولتا اللہ جی..میں کیا کروں..کدھر جاؤں..تو نے یہ رنگ مجھے پہلے کیوں نہیں دکھائے..یہ رنگ میری زندگی میں پہلے کیوں نہیں آئے..میری بیوی پہلے کیوں آئی..''

''یار عمران ڈرامہ بند کرو..'' میں نے بیزار ہو کر کہا..

''دلی کیفیت ہے سر جی..قسم سے ڈرامہ نہیں کر رہا..'' وہ اٹھا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا'' معافی چاہتا ہوں لیکن آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میرے ساتھ یہ ہونے والا ہے''..اور'' یہ'' کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ لہرا کر جھیل کے پورے کینوس پر بچھے شیشہ گری کے کام اور رنگوں کی جانب اشارہ کیا..

''فرینکلی عمران..مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ ہونے والا ہے..میں تمہیں کیا بتاتا..''

''پچھلی شب تو آپ کہتے تھے کہ یہ جوہڑ ہیں''

''پچھلی رات میں نے جھک ماری تھی..؟''

''مجھے پہلے سے ہی شک تھا کہ آپ جھک مارنے میں ماہر ہیں..لیکن سر شکریہ'' وہ میرے سامنے جھک گیا'' یہ تو اخیر ہے''

''نہیں عمران کوہ نوردی میں کوئی اخیر نہیں ہوتا..ممکنات اور طلسم کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا..کوئی آخری سرحد نہیں ہوتی..یہی تو آوارگی کی شان ہے کہ عقیدے..حب الوطنی اور شاید محبت کی بھی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے..لیکن یہ تو وہ دشت امکان ہے جس میں آرزو کے قدم دھرتے جاؤ تو یہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے''

''یقیناً..'' عمران نے بیزار ہو کر اپنی ٹیکر ٹو لنے کا عمل پورا کیا'' لیکن اب ذرا سنجیدہ ہو کر کچھ کام کر لیں..''

''مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟''

''سر جی..آپ اپنے آپ میں گم..کیمرے کے وجود سے غافل جھیل کے کناروں پر چلتے جائیے..اپنی حیرت کو برقرار رکھئے..کبھی رکئے اور اس کے پانیوں میں ہاتھ ڈال کر ان کی کرچیاں کیجیے..کبھی چہرے پر چھینٹے ماریئے اور مسکرائیے..کسی تنے کو پھلانگ کر دوسری جانب جائیے..یہ کچھ کرتے جائیے..بلکہ وہ کچھ جو آپ کرنا چاہتے ہیں کرتے جائیے اور میں ایک بے دام غلام کی مانند کیمرے کے ساتھ آپ کا پیچھا کرتا چلا آؤں گا..''

اگرچہ عمران کبھی غلاموں کی منڈی میں برائے فروخت ہوتا تو میں اسے بے دام بھی حاصل نہ کرتا لیکن میں نے وہی کیا جو وہ کہتا تھا..اس جھیل کا کمال یہ تھا کہ اس نے اس متروک شدہ اداکار کو بھی فراموش کروا دیا جو اس آفت نالے کو پار کرتے ہوئے بھی چوکنا رہا تھا..

میں جو اس کے کناروں پر چلتا تھا تو اپنے آپ میں چلتا تھا..کیمرے کی موجودگی مجھ پر ذرہ بھر اثر انداز نہ ہوتی تھی..

چلتے چلتے وہ ٹیلا آیا جس کے عقب میں سے برآمد ہو کر ہم پچھلی شب اپنی خیمہ گاہ میں اُترے تھے..یہاں سے جھیل رخ بدلتی تھی اور دوسرا کنارہ شروع ہو جاتا تھا..اور یہاں چلنا آسان نہ تھا کہ راستے میں کچھ چٹانیں تھیں..

ان چٹانوں سے آگے لمبی گھاس اور نم آلود فرش کے جھیل کنارے تھے..کچھ پتھر تھے..

یہاں سے پار کا منظر دکھائی دیتا تھا اور وہ پار بھی کچھ زیادہ دور نہیں تھا..

یہ جھیل آپ کے بس میں تھی.. آپ کی پاکٹ میں تھی.. یہ اتنی مختصر اور منی ایچر تھی..

یہاں.. دوسرے کنارے پر تو یہ جھیل سامری ہو گئی.. اس کے سحر کا کوئی حساب نہ تھا.. یہ ابھی ابھی سونے کا بچھڑا جنم دے سکتی تھی..

پانی کی قربت میں ہو کر.. پار کے منظر کو اپنے اندر اتارنے اور جمع کرنے کی خاطر میں اس کے دلدل نما کنارے پر بیٹھ گیا..

''سر جی.. آپ ذرا اپنے خیالوں میں گم جھیل کے پانیوں پر ایک کنکر پھینکئے میں اس کو فالو کروں گا..''

میں نے ایک کنکر پھینکا..

وہ کنکر سطح آب پر.. اس شیشۂ آب پر گرا.. چھپاک سے گرا.. اور پانیوں میں میری نظروں کے سامنے اُترتا گیا.. ایک بھاری کٹی پتنگ کی مانند ڈولتا جھیل کی تہہ تک گیا اور وہاں بیٹھ گیا.. اور میں حیرت سے اُسے دیکھتا گیا..

''ایک اور پتھر پھینکئے سر.. میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا..''

میں نے ایک اور کنکر تلاش کر کے آہستہ سے جھیل پر پھینکا.. اور وہ بھی سطح آب سے نیچے ہوا.. میری نظروں کے سامنے ڈولتا بالآخر تہہ کے اس حصے میں جا بیٹھا جہاں سے ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا.. اُس پتھر کے ارد گرد بلبلے پھوٹ رہے تھے اور مجھے یہ لگ رہا تھا کہ میں ایک گھریلو ایکویریم سے ناک چپکائے اُس کی تہہ میں سے پھوٹنے والے آرٹی فشل بلبلوں اور زیبائشی پتھروں کو دیکھ رہا ہوں.. یہ پانی اتنے شفاف تھے..

میں کیمرے سے غافل تو تھا اب اور غافل ہو گیا..

یہ ایک کھیل تھا..

میں نے ایک اور کنکر پہلے کی نسبت بڑے حجم کا کنارے سے کچھ فاصلے پر پانیوں پر پھینکا.. اب اس کی آبی تصویر کچھ اور بنی.. پتھر جھیل کی سطح پر گرا تو فوراً پانیوں پر دائرے در دائرے پھیلنے لگے اور میں حیرت در حیرت تھا کہ یہ دائرے بلکہ ان کا سایہ جھیل کی تہہ میں بھی اسی طور پھیلنے لگا.. اور ہاں اس عمل کے دوران ایک درمیانی منظر بھی تھا جب وہ پتھر سطح آب سے نیچے اُترتا تھا تو اوپر بنے ہوئے دائروں کی تہہ میں تخلیق ہوتے سایوں کے درمیان میں وہ پتھر جا بیٹھتا تھا.. یہیں

اسی مقام پر گھاس پھونس اور جھیل میں گرے پتوں اور برچ کی سفید شاخوں کے درمیان میں جب میں نے غور سے دیکھا تو کنارے کے پانیوں میں ایک چھوٹی سی مچھلی تیرتی تھی.. اور وہ بھی ایک گھریلو ایکویریم میں قید مچھلی کی مانند دکھائی دیتی تھی.. ہریاول.. گھاس اور بوسیدہ پتوں کے درمیان تیرتی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی.. تیرتی اور جب کوئی گھاس یا کائی کی رکاوٹ آتی تو پھڑکتی اس سے بچ کر نکلتی اور پھر تیرتی..

عام جھیلیں ایک مناسب فاصلے سے شاندار اور پُرشکوہ دکھائی دیتی ہیں.. پس منظر کے برف پوش سلسلے.. گھاٹیاں اور آسمان اس کے سحر میں اضافہ کرتے ہیں.. لیکن یہاں سے الگ ایک اور جھیل تھی.. فقط یہ جھیل تھی جسے فاصلہ بے شناخت کر دیتا تھا اور اسے قربت حُسن دیتی تھی.. اسے اس کے پانیوں پر آنکھیں بچھا کر ہی دیکھا جا سکتا تھا کہ جو کچھ تھا اس کے باطن میں تھا، اس کی تہہ اور شفافی میں تھا..

یہ وہ قربت تھی جس میں چہرے اور بدن معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وصل کی آنچ باقی رہ جاتی ہے..

جھیل کے پانی رنگ بدلتے تھے..

کہیں تہہ میں کائی جو سرسراتی تھی زندہ لگتی تھی.. گھنے سبز اور بھورے خزاں رسیدہ بھورے رنگ کی کائی.. زندہ لگتی تھی.. اور جہاں چشمے پھوٹتے تھے وہاں جھیل کی تہہ گہرے نیلے رنگ کی تھی.. کہیں پتوں اور ٹہنیوں کے گھلنے سے ایک مٹیالی دلدل نظر آتی تھی.. چنانچہ دور سے اس کے پانی رنگوں میں بٹے ہوئے لگتے تھے.. جیسے کسی نادان رنگ ریز نے چُنریا کو ایک رنگ میں رنگنے کی بجائے مختلف رنگوں میں رنگ دیا ہو.. یا پانی سے بھرے ایک ٹب میں کسی بچے نے کئی رنگوں کی پچکاریاں چلا دی ہوں.. یہ بہاولپور کی وہ اوڑھنی تھی جسے صحراؤں کی بانکی نار.. گرمی سے رسیلی ہوتی نار اوڑھ کر دیس پیا کے جاتی ہے..

جھیل ملتر کا پس منظر اور محل وقوع بھی نہایت معمولی تھا.. اور نہ ہی اس کا کوئی واضح حدود اربعہ تھا.. یہ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے پانیوں کا ایک مجموعہ تھی جس کے کنارے بھی اس لیے واضح نہ تھے کہ کہیں کچھ پتھر تھے اور کہیں اس میں درخت گرے ہوئے تھے..

یہ جھیل کی کسی بھی تعریف پر پوری نہیں اُترتی تھی اور پھر بھی یہ ایسی تھی کہ اس کی تعریف کے لیے لفظ کم پڑتے تھے..

"رنگوں کے فریب.. نظر کے دھوکے.. پانیوں نے مجھے بے ایمان کر دیا"

ہماری خیمہ گاہ میں کوچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں..

خیمے سمیٹے جا چکے تھے.. دونوں گدھوں پر سامان باندھا جا رہا تھا.. پورٹر اپنی آخری چائے پی رہے تھے اور ابراہیم ناشتہ سرو کر رہا تھا..

میں بے ایمان ہونے لگا..

جھیل کے پانیوں پر آنکھیں بچھاتے رنگوں اور شفافی کے معجزے کو ان پانیوں کے نیچے رونما ہوتے دیکھتے میں بے ایمان ہونے لگا.. ابھی سویر تھی اور پانیوں پر کہیں دھوپ تھی اور کہیں نہیں تھی.. کہیں سائے بچھے تھے اور کہیں وہ روشن تھے لیکن ابھی تھوڑی دیر بعد ہر شے بدلنے کو تھی..

جھیل نے دھوپ سے بھر جانا تھا تو یہ رنگ اور یہ سائے اور پانی کی روشنائی نے کچھ اور ہو جانا تھا..

پھر دوپہر کے وقت اس کا روپ کچھ اور لشکیلا ہو جانا تھا.. اور پھر سرِ شام یہاں ایک زرد اور بجھتے ہوئے سنہری رنگ کی قیامت کا نزول ہونا تھا.. غروب کی زرد کرنوں نے اسے سونے سے پوچ دینا تھا.. اور مجھے یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے آج یہاں ٹھہرنا چاہیے تھا..

میرے سامنے جھیل کا وہ حصہ دھوپ میں تھا جہاں ابھی ابھی ایک کنکر دائرے بناتا تہ تک اُترا تھا اور میں ان دائروں سے مسحور ہو کر اس کے کنارے پر ایک تماشائی کی مانند بیٹھا تھا..

میں ازل سے جھیلوں میں اترنے کا تمنائی تھا..

جھیل کو آپ تب تک نہیں جان سکتے جب تک آپ اس کے اندر اتر کر اس کی سانسیں

نہ سنیں.. اس کی گیلاہٹ کو اپنے بدن کا حصہ نہ بنائیں.. اس کی سردی کو اپنی حدت سے نم آلود نہ کریں.. ایک جھیل کو آپ تبھی جان سکتے ہیں..

عمران مجھ سے فارغ ہو کر اب جھیل میں سے نکلنے والے ایک گھاس بھرے کناروں میں دمکتے سفید نالے کو شوٹ کر رہا تھا اور جو نیچے دریا میں شامل ہونے جا رہا تھا..

"عمران.." میں نے اُسے پکارا..

وہ کیمرہ سنبھالتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری جانب آنے لگا..

وہ قریب ہوا تو میں نے کہا "جہاں میں نے کنکر پھینکا تھا.. جہاں پانی اتنے شیشہ ہیں کہ دھوپ میں نظر ہی نہیں آ رہے.. تو میں اسی سپاٹ پر اگر میں کپڑوں سمیت کود جاؤں تو کیسا رہے؟"

"آپ کو نمونیہ ہو جائے سر تو کیسا رہے.."

"میں سیریس ہوں"

"میں بھی سیریس ہوں سر.."

"دیکھو عمران.. اگر تم اپنے کیمرے کے ساتھ چوکنے رہو.. کیونکہ اس شاٹ کی ری ٹیک نہیں ہو سکتی.. تم بالکل تیار رہو اور جب میں اس مقام پر غڑاپ سے گروں تو تم مجھے فالو کرو.. میں ان پانیوں میں دھیرے دھیرے تہ تک اترتا ہوا دکھائی دوں گا.. میں سانس بند رکھنے کی کوشش کروں گا اور پھر جب تہ کو چھوؤں گا تو اسے اپنے جوگرز سے دھکیل کر پھر سے آہستہ آہستہ سطح آب پر ابھر آؤں گا.. یہ شاٹ کیسا جادوئی اور ناقابلِ یقین ہوگا.. اس میں میرا بے ڈول بدن اگرچہ کامیڈی تخلیق کرے گا لیکن پھر بھی شاٹ شاندار ہوگا.. کیا خیال ہے"

اور میری اس خواہش میں قطعی طور پر خودنمائی کو کچھ دخل نہ تھا، عمران کا کیمرہ تو محض ایک بہانہ تھا.. اور میں اس جھیل میں اترنے کے لیے اسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ عمران اگرچہ میری موت کا تمنائی لگتا تھا لیکن وہ بھی جھجک گیا، نیکر کو ترک کر کے داڑھی ٹٹولنے لگا "ویٹ ول بی اے پرتھنگ.. لیکن تارڑ جی کیا آپ.. میرا مطلب ہے.. عمر کا مسئلہ تو ہے ناں تو کیا آپ اس کے برف پانیوں کو سہہ جائیں گے؟"

"ہاں.. میں نے تو کے ٹو کے راستے میں بھی ایک گلیشیئر سے رستے پانیوں سے اشنان کر لیا تھا.."

"وہ تو بہت برس پہلے کی بات ہے.."

''یار میں تمہیں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک زبردست زندگی میں صرف ایک بار سامنے آنے والا شاٹ آفر کر رہا ہوں اور تم بحث کرتے ہو''

''اور کیا آپ تہہ تک اترتے سانس روک کے رکھ سکتے ہیں؟''

''ہاں بالکل.. وہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی چھ سات فٹ ہو سکتی ہے.. اور یہ زیادہ نہیں''

''اور کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ بعد میں آپ اپنے کپڑے بدل سکیں.. گیلے جوگر اور جرابیں اتار کر سکھا اور پہن سکیں کیونکہ قافلہ تیار ہے.. صرف ہمارا انتظار ہے.. ابھی ابھی سلیم دوسرے کنارے پر غصے میں ہاتھ ہلاتا ہوا دکھائی دیا تھا..''

''اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں بے ایمان ہو چکا ہوں''

''کیسے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ آج یہیں ٹھہر جائیں.. اس جھیل کو دن کے مختلف رنگوں اور روشنیوں میں دیکھیں.. میں لیڈر ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ سامان کھول دو ہم آگے نہیں جا رہے''

''ہاتھ ملائیں سر..'' عمران کی داڑھی میں سے بھی مسرت چھلکنے لگی۔ ''میں بھی بے ایمان ہو چکا ہوں.. یہاں دھوپ کے زاویے بدلیں گے تو پانی بدلیں گے.. رنگوں کے فریب ہوں گے.. نظروں کے دھوکے ہوں گے اور میں انہیں شوٹ کروں گا.. میں آپ کے ساتھ ہوں.. ہاتھ ملائیں سر''..

''تو پھر تم اپنے کیمرے کو نشر میں کرو... میں جھیل میں کودنے کو تیار ہوں''

کاظمی اور طاہر اس مکالمے میں حصہ دار نہ تھے وہ گونگے خادموں کی طرح عمران کے دائیں بائیں منکر نکیر ہوتے تھے اور اپنے اپنے آلات تھامے اس کے حکم کے منتظر تھے..

دوسرے کنارے پر.. اور اس کنارے کے عقب میں خیمہ گاہ تھی اور ہم چلتے چلتے اس کنارے پر آ چکے تھے.. تو دوسرے کنارے پر کوئی شخص ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں بلاتا تھا.. اور یہ شخص ابراہیم تھا جو ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش میں تھا اور ''ناشتہ... بریک فاسٹ سر'' چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا..

''ابھی صاحب اُدھر جھیل میں چھلانگ لگائے گا پھر آئے گا'' عمران نے بھی جواباً چیخ کر اسے مطلع کیا..

ابراہیم یہ جواب سُن کر وہاں کھڑا نہیں رہا.. ایک غزال کی مانند قدمیں بھرتا جھیل کا چکر لگا کر اچھلتا کودتا چند لمحوں میں ہمارے پاس پہنچ گیا'' کیا کہتے ہو صاحب..''

''ابھی تارڑ صاحب.. ادھر پانی میں کودے گا تو ہم فلم بنائے گا.. پندرہ بیس منٹ کا کام

ہے.. تم چلو ہم ابھی آتا ہے اور پھر ناشتہ کرتا ہے..''

''نہ صاحب..'' اس نے سر ہلایا..

''کیا.. نہ صاحب؟'' میں نے پوچھا

''ادھر جھیل میں بالکل نہیں اترو... اس کا تہہ میں بہت دلدل ہے.. نیچے جائے گا تو اوپر نہیں آئے گا.. دلدل میں پھنس جائے گا.. ادھر ایک میم صاحب بھی کپڑے اتار کر اندر گیا تھا تو نیچے پھنس گیا تھا بڑی مشکل سے نکالا تھا.. بعد میں ادھر ننگا بیٹھ کر روتا تھا.. نہیں اُترو بہت خطرہ ہے..''

ہم کچھ دیر اس دھیان میں رہے کہ میم صاحب ادھر ننگا بیٹھ کر جب روتا تھا تو کیسا لگتا تھا پھر میں نے پوچھا ''یار.. کتنا دلدل ہوگا..''

''اتنا..'' ابراہیم نے اپنی شلوار کے پائنچے سمیٹ کر اوپر کئے اور کنارے سے دو تین قدم پانی کے اندر گیا.. اور وہ جس مقام پر کھڑا ہوا تو واقعی آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا اور پھر جلدی سے پاؤں اکھاڑتا باہر آ گیا'' صاحب ادھر اتنا دلدل ہے تو آگے آپ اندازہ کرو''

''اندازہ کر لیا..'' میں نے جھیل میں کودنے کا ارادہ فی الفور ملتوی کر دیا۔

''صاحب بہت زمانوں سے اس جھیل میں پتے' درخت اور گھاس وغیرہ گرتا ہے تو نیچے اس کا دلدل بنتا جاتا ہے.. بس جدھر سے چشمہ نکلتا ہے تو بس وہاں پانی کے زور سے کچھ نہیں ٹھہرتا اور تہہ صاف رہتا ہے لیکن اُدھر.. مت اترو۔''

''تو پھر ادھر اُتر جائیں جہاں چشمے پھوٹتے ہیں.. وہاں تو دلدل نہیں۔''

''نہیں سر..'' عمران بولا'' وہ جگہ سائے میں ہے اور آپ تہہ تک جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے اور وہاں پانی بھی گہرا لگتا ہے..''

اگر اس لمحے ابراہیم نمودار ہو کر مجھے خبردار نہ کر دیتا تو کیا ہوتا.. وہی ہوتا جو تقریباً چالیس برس پیشتر پیرس کے دریائے سین میں ایک حالت بے خودی میں چھلانگ لگا دینے سے ہوتا ہوتا بچا تھا..

''ناشتہ ٹھنڈا ہوتا ہے سر.. دیسی انڈہ کا آملیٹ بنایا ہے.. ٹھنڈا ہوتا ہے تو ربڑ کا ہوتا ہے سر.. آ جاؤ.. آپ کا ٹیم بھی انتظار کرتا ہے''

ہم آ گئے.. بادل نخواستہ آ گئے.. ٹرک سیک بھی پیک ہو چکے تھے.. گدھے بھی تیار تھے.. اور ہمارے ساتھی بڑبڑا رہے تھے.. خیمہ گاہ میں آئے تو جھیل پتھروں کی اوٹ میں چلی گئی اور اس کی

جدائی بڑی گی.. نزدیک ترین بڑبڑاتا ہوا ساتھی سلیم تھا" یار سلیم.. میں سوچ رہا تھا کہ آج یہیں ٹھہر جاتے ہیں.. عمران اینڈ کمپنی بھی متفق ہے.. جھیل کو سارا دن دیکھنے کی آرزو ہے.. اسے سویرے سویرے سرسری طور پر بھگتا دینا تو زیادتی ہے.. بلکہ بدتمیزی اور بے ایمانی ہے.. اس کے رنگ رنگ کے رنگ دیکھیں گے.. ہمارے پیچھے پولیس تو نہیں لگی ہوئی کل چلے جائیں گے.. اور پھر تمہیں یہ بھی تو بتانا ہے کہ عشق کیا ہے.. کہ نہیں؟''

''تارڑ صاحب مجھے تو کوئی اعتراض نہیں'' اور اس نے یہ کہا ایسے ہی کہ مجھے تو سخت اعتراض ہے'' لیکن صرف ایک قباحت ہے کہ سامان پیک کر کے پورٹر تو کب کے جا چکے ہیں..''

''یار میں کیسا لیڈر ہوں کہ میری اجازت کے بغیر ہی پورٹر چلے گئے ہیں'' میں ذرا طیش میں آ گیا..

''تارڑ صاحب پچھلی شب جب ہم یہاں پہنچے تھے تو آپ نے سب کے سامنے ایک تقریر کی تھی کہ یہ ہم کیسی واہیات جگہ پر آ گئے ہیں.. جھیلوں کے کنارے نہیں آئے جوہڑوں کے کناروں پر آ گئے ہیں تو کل صبح سویرے منہ اندھیرے یہاں سے نکل چلو.. پورٹروں کو بھی آپ نے یہی آرڈر دیا تھا..''

میں نے کہا تو یہی کچھ تھا..

اور وہ کیا کہتے ہیں کہ خود کردہ را علاجے نیست..

تو میں اپنے کہے کی مار کھا گیا تھا..

''یار کوئی سبیل نہیں ہو سکتی ٹھہرنے کی..''

اور اب میاں فرزند جو صرف بڑبڑا نہیں رہے تھے اندر ہی اندر کھول رہے تھے پھٹ پڑے'' سبیل تو محرم میں لگائی جاتی ہے جناب عالی'' انہوں نے ایک خصوصی لاہوری بلکہ بھاٹی دروازے کا کھنگورا مارا'' آپ ناں اس ٹریک میں کچھ آف ٹریک ہو رہے ہیں.. بلتر پھوڑا ٹریک پانچ دن کا ہے.. اور آپ نے گلگت میں جیپ ڈرائیوروں کو کہہ دیا تھا کہ آج سے پانچویں دن کے اگلے روز پھوڑا پہنچ جائیں اور ہمیں واپس گلگت لے جائیں.. تو ہم کیسے کسی بھی جگہ ایک رات سے زیادہ ٹھہر سکتے ہیں.. اگر ٹھہرتے ہیں تو پورٹر بھی ناراض ہوں گے اور پھوڑا میں آئی ہوئی جیپیں بھی خالی گلگت واپس چلی جائیں گی اور انہیں ایڈوانس میں دی ہوئی رقم بھی ضائع ہو جائے گی.. اب کرو بات..''

میں کیا بات کرتا.. چپ رہا..

ہر برس میں اپنے آپ سے وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ برس اگر زندگی ہوئی اور کوہ نوردی نصیب ہوئی تو اس میں دنوں اور شیڈیول کی کوئی زنجیر نہیں ہوگی.. قتل و غارت اور مار دھاڑ نہیں ہوگی کہ آج ہر صورت اس منزل پر پہنچو.. راستے میں کہیں بھی رات کرنے کو جی چاہے تو اپنے آپ پر جبر کرو.. چلتے رہو.. منزل پر جا رات کرو.. اور پھر اگلی صبح مارو مار کرتے.. گرتے پڑتے.. جیتے اور بار بار مرتے اس سے اگلی خیمہ گاہ میں جا گرو.. میں نے اپنے آپ سے ہر مرتبہ یہی وعدہ کیا تھا کہ اس بار کوہ نوردی ایسی ہوگی کہ جہاں بھی من چاہے گا.. بے شک روانگی سے چند لمحوں کے بعد ہی چاہے تو وہاں پڑاؤ کر لیں گے اور تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں گے.. جب تک وہاں سے کوچ کرنے کو جی نہ چاہے.. لیکن کیا قیامت ہے کہ باقاعدہ ٹریکنگ میں یہی تو آزار ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی کے بغیر یہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی.. من کی موج کے ساتھ کوئی بھی بستی آباد نہیں کی جا سکتی اُسے شیڈیول کے مطابق ہی بسانا پڑتا ہے.. چنانچہ میں نے اپنے آپ کو وہی جھوٹی طفل تسلی دی جو میں ایسے مقامات سے کوچ نہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو دیتا آیا تھا کہ ابھی تو روانہ ہونا ہے لیکن انشاءاللہ پھر آئیں گے اور اطمینان میں آئیں گے اور پھر کہیں نہیں جائیں گے یہیں رہ جائیں گے..

اور میں نے اپنے آپ کو یہ طفل تسلی کوئی پہلی بار دی تھی.. میری حیات میں ایسی طفل تسلیوں کا ایک ڈھیر تھا.. کبھی افغانستان کی کسی کارواں سرائے میں.. جب بجلی چمکتی تھی.. اور کبھی نوح کے پہاڑ کے دامن میں.. شہزادوں کے جزیروں میں اور بیروت کی خانہ جنگی میں.. اور ہاں جب اطالیہ اور سسلی کے سمندروں میں سے میرا جہاز گزرتا تھا اور کوہ ایٹنا رات کی گھنی تاریکی میں اناروں کی مانند پھوٹتا اور آگ برساتا تھا اور جہاز کے عرب مسافر '' النار.. النار'' پکارتے تھے کبھی فلارنس میں اور کبھی سویڈن کے جنگلوں میں.. کبھی دامن کوہ کے دامن میں ایک خشک گھاس کے میدان میں ایک دیا سلائی کے سلگنے سے آگ پھیلنے سے.. یا پھر سنو لیک پر آلتی پالتی مارے میں نے یہی خواہش کی تھی کہ یہاں ٹھہر جاؤں.. آگے نہ جاؤں.. اور اپنے آپ کو یہی طفل تسلی دیتا تھا کہ میں پھر بھی یہاں آؤں گا اور قیام کروں گا..

تو یہی طفل تسلی یہاں تھی.. بلتر جھیلوں کو چھوڑتے ہوئے بھی میرے کام آئی.. البتہ عمران نے اپنا تیسرا دیسی انڈہ نوش کرنے کے بعد علم بغاوت بلند کر دیا'' سر آپ لوگ بے شک چلے

جائیں میں نہیں جانے کا.. میں نے آج اس جھیل کو اپنے کیمرے کے لینز میں سے دیکھا ہے تو احساس ہوا ہے کہ میں نے آج تک اس لینز کے راستے جو کچھ دیکھا ہے.. ٹاپ کلاس ماڈلز کے ٹاپ کلاس بدن دیکھے ہیں.. اور حیران کن منظر اور لوگ دیکھے ہیں تو میں آج تک جھک مارتا رہا ہوں.... میں لیڈر کی نافرمانی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ہی تو مجھے یہاں تک لائے ہیں لیکن صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ چلیں.. روانہ ہو جائیں.. میں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا ہوں.. جھیل کو دن کی مختلف روشنیوں اور سایوں میں شوٹ کرنا چاہتا ہوں.. صرف دو گھنٹے عنایت کریں.. آپ چلیں میں آپ سے آملوں گا''

''کیسے آملو گے تم راستے سے واقف نہیں ہو.. یہ نہ ہو کہ بھٹک جاؤ''

''آملیں گے سر جی..'' کاظمی بولا.. اور اس نے آج سویرے پہلی بار منہ کھولا.. اپنے دانت دکھلائے جو ایک دوسرے سے الگ الگ، اجنبی اور خاصے فاصلے پر تھے'' شوٹنگ سے فارغ ہو کر ہم تینوں کچھ مست الست دھواں اپنے اندر اتاریں گے اور پھر پہاڑ.. دریا اور ندی نالے پھلانگتے آپ کو جالیں گے بلکہ آپ سے بھی آگے نکل جائیں گے.. آپ چلیں سر جی....''

''مائی لیڈر دیر ہو رہی ہے.. بسم اللہ کریں'' شاہد نے درخواست کی..

''اگر آپ لوگ اجازت دیں'' میں نے چلنے کو تیار، بے چینی سے پہلو بدلتے اپنے ساتھیوں سے گزارش کی'' میں اپنے دانتوں کو برش کر لوں؟''

''دوبارہ برش کریں گے جناب عالی؟'' میاں صاحب حیران ہو گئے..

''آہو..'' میں نے خوش ہو کر کہا..

''مائی لیڈر آپ کے دانت پہلے ہی کمزور ہیں.. دوبارہ برش کریں گے تو شائد ان میں سے ایک آدھ گر پڑے.. کیوں رسک لیتے ہیں.. بہر حال آپ لیڈر ہیں.. جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں..''

وہ سب مجھے دوبارہ برش پر پیسٹ لگاتے ہوئے نہایت غور سے دیکھتے رہے کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے.. اور یہ شخص کسی نہ کسی بہانے ایک مرتبہ پھر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا..

بڑے پتھر کے پار میں اسی مقام پر پانی کی قربت میں ہو بیٹھا جہاں آج سویرے بیٹھا تھا اور پھر جھک کر اپنے ٹوتھ برش کو پانی میں ڈبویا.. ڈبویا تو پانی کی سطح چند لمحوں کے لیے کرچی کرچی ہوئی، شیشے کی شفافی ٹوٹی اور جڑ گئی.. لیکن میری انگلیاں، ان میں تھاما ہوا برش اور برش پر لگی ہوئی

نیلی ٹوتھ پیسٹ جھیل طلسم کے پانیوں میں یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ پانی میں نہ ہو میری نظر کے سامنے ہو.. وہ ایسی شفاف تصویر تھی..

اور کیسے کیسے رنگ اس کے پانیوں کے تھے..

اناڑی رنگ ریز نے اس جھیل کی چنریا کو کیسے رنگا تھا کہ رنگ ہی رنگ رنگ، بے تھے..

اور میں اس چنریا کو چند لمحوں کے لیے دیکھ سکا تھا اوڑھ نہ سکا تھا.. رنگ ریجوا نے پانیوں کو کیسی سندرتا دی تھی.. لیکن وہ جو برہا کی ماری تھی.. نصیبوں جلی تھی.. نہ اسے اوڑھ سکی اور نہ ساجن کو لبھا سکی..

''نیلاہٹ کے دو جزیرے دکھائی دیتے ہیں.. اور یہ عشق کیا چیز ہے''

یہ پہلی جھیل تھی جس سے جدا ہوتے ہوئے میں نے اُسے مڑ کر ایک بار بھی نہ دیکھا..

خیمہ گاہ کے پتھروں کے پہلو میں سے اُکھڑتی بلندی پر سانس تھامے آہستہ آہستہ چلتا گیا.. اوپر چند درختوں کا ایک مختصر ذخیرہ تھا جس میں سے ایک راستہ سیدھا جا رہا تھا لیکن ہم اسے چھوڑ کر ایک پتھر کے دامن میں سے نیچے اُترتے ایک پُرشور نالے کے قریب آ گئے.. نالے پر چند لکڑیوں کا ایک مخدوش سا پُل تھا جسے ہم نے باری باری سنبھل سنبھل کر پار کیا.. پار ہوئے تو ایک خدشے نے سر اُٹھایا کہ پورٹر تو آگے جا چکے ہیں تو وہ کون سے راستے پر گئے ہیں.. جنگل میں سے نکلنے والے سیدھے راستے پر یا وہ بھی اس نالے کے پار ہو کر کہیں آگے جا چکے ہیں.. پھر بہت دور ایک بلند راستے پر ایک پورٹر ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا.. یہی راستہ تھا..

پُل کے دوسری جانب ایک ڈھلوان تھی جس کے درمیان میں ایک پگڈنڈی چلی جا رہی تھی اور نیچے پچھلے دریا سے لمحہ بہ لمحہ اونچی ہوتی چلی جاتی تھی.. ہم اس نسبتاً آسان راستے پر بلند ہوتے ڈھلوان کی چوٹی پر پہنچ گئے.. دوسری جانب ایک بے حد وسیع منظر کھلتا تھا ایک بہت چوڑی وادی نظر آ رہی تھی.. ایک دل کو خوش کر دینے والی کشادگی تھی.. اس کشادگی کے درمیان مٹیالے رنگ کا ظفر دریا.. یا نالہ خاموشی سے لیٹا ہوا تھا اور اس کے وسیع کنارے پتھروں کے سلسلے تھے اور گیلی ریت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی ندیاں نالے سے جدا ہو کر بکھرتی جاتی تھیں.. کہیں گھاس کے میدان تھے جن میں مویشی ساکت نظر آتے تھے.. اور پھر وہ بلند اور برفپوش پہاڑ تھے جو اس وادی

کے پہرے دار تھے.. اس کی سرحد تھے..

یہ منظر تو سامنے کا تھا..

اور جو کچھ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے یا نیچے چھوڑ آئے تھے وہ بھی ایک کمال کی تصویر تھی.. وہ پُل جسے ہم ابھی ابھی پار کر کے آئے تھے یہاں سے ایک کھلونا پُل لگ رہا تھا.. نالے کا شور سکوت میں جا چکا تھا اور اس کی تندی تھمی ہوئی لگتی تھی.. اس کے پیچھے جو پہاڑی سلسلے تھے ان میں دو جھیلیں جھلکنے کو آتی لگتی تھیں.. میں اور میرے ہمراہی شدید حیرت سے دوچار ہوئے کہ ہم ان کی موجودگی سے آگاہ نہیں تھے.. ہمیں ان کے وجود کی خبر تک نہ تھی..

اُن میں سے ایک جھیل کے کنارے واضح نہ تھے.. صرف پتھریلی چٹانوں میں گھرے ہوئے شدید سبز رنگ کے پانی تھے اور پاکستانی پرچم ہوتے جاتے تھے..

اس سے اوپر.. ذرا بلند سطح پر ایک اور جھیل نظر آ رہی تھی.. وہ پتھروں کی سلیٹی رنگت کی قید میں شدید نیلاہٹ کا ایک دل فریب جزیرہ تھی..

میں بہت دیر تک رُکا رہا.. انہیں دیکھتا رہا.. مجھے خبر نہیں تھی کہ ظفر جھیل کی خیمہ گاہ سے بلند ہو کر درختوں کے ذخیرے میں سے جو راستہ سیدھا چلا جاتا ہے وہ انہی جھیلوں تک جاتا ہے.. بہت بعد میں ایک عادی اور کوہ نوردی کے جنون میں مبتلا شخص نے بتایا کہ جھیل ظفر سے پہلی جھیل صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں اور دوسری جھیل قدرے بلندی پر ہے اور زبردست نظاروں والی ہے.. لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں بلکہ جھیلیں چگ گئیں کھیت..

میں نے ایک آخری نگاہ ان انجانی جھیلوں پر ڈالی.. اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابوعبداللہ کی مانند ایک آخری آہ بھری.. اُس نے غرناطہ کو آخری بار دیکھ کر بھری اور میں نے ان جھیلوں کو ہی اپنا غرناطہ جان لیا.. اس کی آہ مور کی آخری آہ کہلائی.. لیکن یہ تارڑ کی آہ تھی اور ہرگز آخری نہیں تھی کہ کوہ نوردی میں ایسے مقامات آہ و فغاں آتے ہی رہتے ہیں..

اُس اونچائی کے دوسری جانب ہم اُس عظیم وسعت والی وادی میں اُترے.. اُترے تو جھیل ظفر کا علاقہ ڈھلوان کے عقب میں روپوش ہو گیا.. ہم نیچے اُترتے گئے..

ایک نالہ عبور کیا جو بہت ہی معصوم سا تھا..

ڈھلوانوں پر گھاس کی تہیں تھیں..

اور کہیں بڑے بڑے پتھروں میں سے ہو کر نکلنا پڑتا تھا.. بالآخر ہم دریا کی بڑے پھیلاؤ

والی وسعت کے کناروں پر اُترے.. جہاں پہاڑ اُتر کر تھمتے تھے وہاں اُترے.. موٹی ریت اور کنکروں کے درمیان دریا کی ایک شاخ مزید شاخوں میں بٹ رہی تھی.. ان کے پانی ٹھنڈے ٹھار تھے یہ ہمیں ہمارے جوگرز نے بتایا کیونکہ انہیں پھلانگتے ہوئے وہ بھیگ چکے تھے.. ان شاخوں کے آگے ہم کچھ دیر ریت پر چلے اور پھر چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم انہی پتھروں پر چلتے گئے..

دریا ہم سے بہت دور جانے کہاں تھا.. تھا بھی یا نہیں.. یہاں سے نہ وہ دکھائی دیتا تھا اور نہ وہ سنائی دیتا تھا..

آج بھی تین فرقے تھے..

گدا اور گرد آمیز کا فرقہ جو ہمیں کفار میں سے جان کر ہم سے بالکل الگ چلتا تھا اور چہلیں کرتا چلتا تھا.. نہایت الگ انداز میں..

عمران اور اس کے بغل بچے جو ابھی تک جھیل طلتر کے کناروں پر تھے اور مجھے ان کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں وہ راستے میں بھٹک نہ جائیں اور قدیمی فرقہ.. جس کے معتقدین میں شاہد، میاں فرزند، سلیم اور یہ فقیر شامل تھا..

لیکن آج میں اور سلیم ساتھ ساتھ تھے..

بلکہ آج تو میں گھوڑا ہو چکا تھا..

ڈاکٹر عمر کی تحقیق کے مطابق پہاڑوں میں پہلے دن انسان بمشکل تھپ تھپ چلتا ہے اور اس کا وہ سب کچھ سوج جاتا ہے جو نہیں سوجنا چاہیے.. اگلے دن اس کا پورا بدن دکھتا ہے لیکن وہ چلتا جاتا ہے اور تیسرے دن.. وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اب میرا کمال ملاحظہ کیجیے کہ میں دوسرے دن ہی گھوڑا ہو گیا.. اس لمحے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے گھوڑا پن کا پہلا اور آخری دن ہے.. آج کے بعد مجھے خچر ہو جانا تھا.. اور سلیم.. وہ اطمینان سے بے تکان چلتا تھا..

''ہاں جی اب تو بتائیں.. دور دور تک نہ کوئی بندہ نہ پرندہ.. اب تو بتائیں کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے..''

''یہ تم بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھتے ہو..؟'' میں نے جھلا کر کہا..

''کیونکہ ایک ہی سوال ہے..''

''اور مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟''

''سر یہ ہے بڑی مصیبت.. بڑی اتھل پتھل بڑی پرابلم ہے.. سمجھ میں نہیں آتی.. آپ سمجھائیں ناں.. آپ پر بہت کچھ بیتا ہے.. تو اپنی ہڈ بیتی سے.. اپنے تجربے سے بتائیں ناں کہ یہ کیا ہے..''

''میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اگر آپ کی محبوبہ کالا شاہ کاکو میں رہتی ہے اور آپ نیویارک چلے جاتے ہیں تو وہاں نیویارک میں ہر چہرے کو اس آس میں دیکھتے ہیں کہ شائد وہ یہاں ہو.. یہ عشق ہے..''

''سوری سر.. یہ تو نہایت بیہودہ ڈیفی نیشن ہے.. کچھ دانشورانہ قسم کی توجیہہ..''

''تو پھر جیسا کہ موہن سنگھ رب کو ایک گنجل دار بجھارت کہتا ہے جسے سلجھانے کی کوشش میں بندہ کافر ہو جاتا ہے.. تو عشق بھی ایک ایسی ہی بجھارت ہے..''

''نہ سر..'' اس نے اپنے غیر متوازن دانت نمائش کے لیے پیش کر دیئے ''یہ تو گھمن گھیریاں ہیں.. مجھے تو سیدھا سادا جواب چاہیے، گنجل بغیر..''

''تو پھر اسے فرید کے، میرا عشق وی توں میرا یار وی توں.. میں تلاش کرو..''

''لو.. میں اب تحقیق شروع کر دوں.. تارڑ صاحب وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا'' میں ایک ملٹی نیشنل میں ایگزیکٹو ہوں.. بڑے بڑے بین الاقوامی گوروں کی آنکھوں میں دھول ڈالتا ہوں مجھ سے ہیرا پھیری نہ کریں..''

''یار سیدھا سادا کالا شاہ کاکو والی محبوبہ کا جواب دیتا ہوں تو کہتے ہو کہ بیہودہ ڈیفی نیشن ہے.. دانش ور ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو پھر اعتراض کرتے ہو..''

''سوری سر..''

''دیکھو میرے لیے یہ شاہ گوری ہے.. جھیل کرومبر ہے.. جھیل طلتر میں آج سویر جتنے رنگ تھے وہ اس کے بدن کے رنگ تھے.. بس اُسی کا وجود اُس کے پانیوں میں رنگ بھرتا تھا.. یہ میرے لیے تھا.. دوسروں کے لیے.. عثمان فقیر کے لیے یہ یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے.. یہ وحدت الوجود بھی ہے اور اناالحق بھی..''

''میری تسلی نہیں ہوئی..'' اس نے سر ہلایا..

''تو پھر تم بھاڑ میں جاؤ.. میرا سانس پھول رہا ہے.. یہ پتھریلے کنارے ختم ہونے میں نہیں آتے.. میرے جوگرز کے اندر لگ رہا ہے کہ پاؤں خون آلود ہو چکے ہیں اور تمہاری تسلی ہی

نہیں ہو رہی.. مجھے جو کچھ معلوم نہیں وہ کیوں پوچھتے ہو.. "اگر معلوم ہوتا تو یوں کہیں بلند پہاڑوں میں بھٹکتا پھرتا"

"یہ تو نرے بہانے ہیں بلند پہاڑوں میں بھٹکنے کے.. آپ کی سرشت میں ہی لکھا گیا ہے کہ ہمیشہ در بدر ہوں.. آپ کے شوق دشت نوردی میں کسی لیلیٰ کا دخل نہیں.. عشق تو محض ایک بہانہ ہے"

"نہیں سلیم.. عشق ہے.. وہ حقیقی ہے یا مجازی یہ میں نہیں جانتا.. لیکن آج سے بتیس برس پیشتر میں اس کی تلاش میں نکلا تھا.. اسے پا لیا ہوتا تو میری تلاش اختتام کو نہ پہنچ جاتی.. میں عمر کے اُس حصے میں ہوں جب دامن میں کوہ کے ایک چھوٹے سے جھونپڑے کی آرزو ہوتی ہے لیکن میں ابھی تک اسی کوہ میں بھٹکتا پھرتا ہوں اس لیے کہ شہرِ آرزو کے دروازے مجھ پر بند ہیں.. میرے ناول "راکھ" کی نُوراں مشاہد علی سے پوچھتی ہے کہ مشاہد جی یہ عشق کیا چیز ہے اور وہ کہتا ہے.. عشق چیز ہے.."

"اور عشق کے بغیر تو سنو لیک بھی ممکن نہیں.." سلیم ہنسنے لگا..

"ہرگز ممکن نہیں" میں بھی کوہ نوردی کے اس چسکے اور بلندیوں کی سرد ہواؤں میں سانس لیتا خوش ہو گیا.. میں آزاد اور لاپرواہ تھا اگرچہ میرے جوگرز میں میرے پاؤں خون آلود لگتے تھے..

"ایک گوجر بستی.. اور پہاڑوں کے سرکس کے بازی گر.."

پتھریلی وسعت اختتام کو پہنچی.. دریا آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتا گیا تھا اور ہم عشق کی ڈیفی نیشن میں اُلجھے اس کی قربت سے بے خبر رہے تھے.. اب وہ شور مچاتا ہمارے قدموں میں پھواریں پھینکتا تھا.. وسیع وادی تنگ ہو گئی تھی اور اب صرف دریا تھا اور اُس کے بُھربُھرے اور خطرناک کنارے تھے جہاں ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے.. گفتگو موقوف ہو چکی تھی کہ شور بہت تھا..

یہ کنارے ایک شہتیروں سے بنے ہوئے پُل تک اُترتے تھے.. اور اس کے پار ہم گئے.. کیوں گئے؟ اسی کنارے پر کیوں نہ چلتے گئے.. کیونکہ آگے ایک پُل تھا اور پُل کے پار ہی جایا جاتا ہے.. پار یکلخت چڑھائی کے معاملات تھے لیکن پُرخطر نہ تھے محض سانس کے لیے ایک امتحان تھے.. پتھروں کے درمیان گھاس تھی اور پتھر بڑے بڑے تھے.. ہم ان میں سے راستہ تلاش کرتے اوپر چلے گئے اور اوپر گوجروں کی ایک بستی ایک پڑاؤ کے آثار تھے..

ہم اس بستی کے باہر درختوں کی چھاؤں میں.. چوٹیوں پر جو ایک بڑا اور سفید اژدھا گلیشیر تھا اُس کی پھونک سرد ہوا کو اپنے بدنوں پر محسوس کرتے بیٹھ گئے اور سستانے لگے..

گلیشیر میں سے چھوٹی چھوٹی برفانی پانیوں کی نالیاں پھسلتی اُترتی تھیں..

ہمارے بدنوں میں چلنے کی مشقت سے جو حدت پیدا ہوتی تھی وہ سرد ہونے لگی..

پسینہ سوکھ کر سرد ہونے لگا..

گوجروں کے جھونپڑوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بچے کونپلوں کی مانند پھوٹنے لگے.. اگرچہ یہ نہایت غلیظ کونپلیں تھیں اور وہ دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے..

سلیم نے انہیں خوش آمدید کہا اور نہایت فراخدلی سے ہر ایک میلی کچیلی ہتھیلی پر ایک ایک چاکلیٹ سویٹ رکھ دی..

''لسی ہے لسی؟'' میں نے پوچھا..

اور وہ تمام بچگان اس جادوئی لفظ کی ادائیگی پر فوراً اباؤٹ ٹرن ہوئے اور بگٹٹ بھاگتے اپنے جھونپڑوں میں گم ہو گئے.. تھوڑی دیر بعد ان میں سے برآمد ہوتے ہیں تو ہر ایک کسی زنگ آلود کنستر.. پلاسٹک کے لوٹے یا ڈبے سے لیس تھا اور ان میں سفید لسی لبریز ہوتی تھی..

یہ ان کے لیے لسی تھی.. ہمارے لیے دہی تھا..

یہ دہی بھی آج سے اٹھارہ برس پیشتر فیری میڈو کی پہلی یاترا کے دوران تاتو کے گاؤں میں مولوی عبدالرحمٰن کے گھی کے گندے کنستر میں پیش کردہ دہی کی مانند قدرے نہیں خاصا مخدوش تھا.. اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور کم سے کم چند مکھیاں.. اور بچوں کی بہتی ناکوں کا کوئی ہلکا سا ذائقہ.. ہو سکتا تھا.. لیکن جناب صفائی اور ستھرائی کے سب نخرے صرف آبادیوں اور بستیوں میں ہوتے ہیں.. کہیں بلند پہاڑوں میں نہیں.. یہاں آپ کو بہت ساری ایسی مفاہمتیں کرنی پڑتی ہیں جو آپ اپنے گھر میں کریں تو اگلے لمحے بستر پر لوٹ پوٹ ہو کر فوت ہو جائیں.. لیکن یہاں کہیں بلند پہاڑوں میں.. کنوارپن سے فحتی سرد فضا، روزانہ کم از کم آٹھ گھنٹے کی پرمشقت سیر، بے فکری، خوشی اور آزادی آپ کی صحت کی ضامن بن جاتی ہیں.. محض چند مُردہ مکھیاں اور کچھ نمکین ذائقہ آپ کی صحت پر چنداں اثر انداز نہیں ہوتا.. چنانچہ ہم اس دہی کو پی گئے.. گھبرا کے پی گئے اور لہرا کے پی گئے.. اور یقین کیجیے کہ ہم نے فرانس اور جرمنی میں جراثیم سے پاک حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت پیک کیا ہوا جو دہی نوش کیا تھا اس میں یہ نشہ اور یہ فرحت نہ تھی..

سلیم نے خوش ہو کر ان بچوں کو مزید ٹافیوں اور کچھ رقوم سے نوازا.. اتنی دیر میں ان کے لواحقین بھی برآمد ہونے لگے.. باریش.. جوان بھی اور سفید داڑھیوں والے بھی بظاہر کھردرے گوجر.. جو موسمِ گرما میں اپنے مال مویشی ہانکتے ان بلند اور گھاس بھری چراگاہوں میں آ جاتے ہیں اپنے بال بچوں سمیت اور ان عارضی جھونپڑوں میں گرمیاں گزار کر موسمِ سرما کی پہلی برفباری سے پہلے پہلے نیچے چلے جاتے ہیں.. نیچے سے مراد وادی کلتر ہے یا پھر ان کے نزدیک نہایت ہی میدانی علاقہ ہے گلگت.. وہاں چلے جاتے ہیں..

یہ اُن کے عارضی پڑاؤ تھے..

وادیٔ سوختر آباد کے داخلے پر بھی ایسے ہی خانہ بدوش گوجروں سے ملاقات ہوئی تھی.. ہم نے ان کی پتھریلی مسجد میں نماز پڑھی تھی.. ایک اوپن ایئر تالاب میں نہائے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے.. کلتر پھسورا ٹریک کے دوران میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گوجر قبیلے کے یہ افراد نہایت ہمدرد اور وضع دار ہوتے ہیں.... آپ کو دیکھ کر نہ خوش ہوتے ہیں نہ ناراض بلکہ نارمل انداز میں ملتے ہیں جیسے آپ بھی انہی کی مانند اپنے مویشی چرانے بلند چراگاہوں کی جانب جا رہے ہیں..

گوجر مجھے بھروسے کے لوگ لگے.. اور میں نے انہیں کوہ نوردوں سے پیسے بٹورنے کے لالچ میں مبتلا نہیں پایا.. شاید اس لیے بھی کہ وہ دیگر پہاڑی لوگوں کی نسبت کھاتے پیتے بلکہ دودھ دہی اور مکھن کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں..

ویسے ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا.. کہ اس مکھی بھرے دہی کو نوش کرنے کے بعد اگر پیٹ میں کوئی انقلاب برپا ہونا ہے تو یہیں ہو جائے.. کچھ روپوش مقام بھی ہیں اور پانی بھی میسر ہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا.. راوی نے چین ہی چین لکھا.. بلکہ ہم پہلے سے کہیں زیادہ فرحت آمیز ہو گئے..

گوجروں کی یہ بستی دریا سے اوپر ایک بلند ڈھلوان پر آباد تھی.. ایک بڑے گلیشیئر کی چھاؤں میں تھی.. ہم اس بستی سے اُٹھے اور پھر سے نیچے اُترنے لگے اور دوبارہ دریا کے کناروں پر آ گئے.... ہم اُس شہتیروں والے پُل کو پار کر کے اتنی مشقت سے اوپر گوجروں کے جھونپڑوں تک جانے اور پھر سے نیچے اُترنے کی بجائے وہیں سے دریا کے کنارے کنارے آگے کیوں نہ چلے گئے.. صرف اس لیے کہ پورٹر حضرات اس راستے سے اوپر گئے تھے..

دریا کے پار جانے کے لیے.. دوبارہ پار جانے کے لیے جو ایک پُل تھا وہ بھی کمال کا پُل تھا.. دو شہتیر اور چند ٹہنیاں.. اور ان پر چلنے کے لیے محض ایک ماہر بازی گر ہونا درکار تھا..

اور ہم تو سب کے سب بازی گر تھے.. کرتب دکھانے والے تھے.. صرف ہمیں دیکھنے والے کوئی تماشائی نہ تھے کہ ہم بلند پہاڑوں کے سرکس میں کرتب دکھاتے تھے.. کوئی ہمیں نہ دیکھتا تھا ہم ایک دوسرے کو دیکھتے تھے کہ واہ میاں صاحب کیا چھلانگ لگائی ہے.. کیا بات ہے شاہد میاں واخانی نالے پر سے کیسے ایسے گزرے ہیں جیسے کوئی تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے.. اور تارڑ صاحب آپ کا تو جواب نہیں.. آپ تو پہاڑوں کے سرکس کے جوکر ہیں.. چلتے ہیں تو دیکھ کر ہنسی آتی ہے..

"تین سیاہ پوش نالے اور پھر.. یاکوں کے غول..
ڈھلوان پر.. ہمارے اوپر گرتے آ رہے ہیں"

اس پل کے پار دریا جو گوجروں کی بستی کے احترام میں ذرا کناروں کے اندر سمٹ گیا تھا پھر سے ایک خوش نظر چراگاہ کے بیچ اطمینان سے بہنے لگا.. اور ہم نے دیکھا کہ اس گھاس بھرے میدانی علاقے میں پانیوں کی نزدیکی میں ہمارے رَک سیکوں کے شوخ رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور پورٹر استراحت فرماتے ہیں اور ابراہیم کے چولہے سے دھواں اٹھ رہا ہے..

یہ لنچ بریک تھی..

ہم اُن کے قریب ہوئے تو ابراہیم کو نہایت متحرک پایا.. اس نے ہمارے گھاس پر ڈھیر ہونے سے پہلے ہی انرجائل کی زرو زندہ کر دینے والی ٹھنڈک پیش کی اور پھر ٹیونافش.. کریکر.. پنیر اور ان کے ساتھ ایسے گرم گرم اور خستہ فرنچ فرائز سرو کیے کہ کیا کسی میکڈونلڈ یا کے ایف سی میں ہونگے.. اور ظاہر ہے ٹومیٹو ساس کی سنگت میں.. اور ان پر مستزاد بھاپ دیتی لبوں کو جلانے والی گرم کافی.. اب کسی بھی انسان کو دنیا جہان سے الگ تھلگ ایک بلند وادی میں اور کیا چاہیے تھا.. اس شاہانہ طعام کے بعد ہم ایک برفانی ندی کے کنارے گھاس پر لیٹ گئے بلکہ لم لیٹ گئے اور اونگھنے لگے... کہیں بلند پہاڑوں میں یہ اونگھ بھی کمال کی چیز ہوتی ہے.. آپ نے اپنے جوگرز اتار دیے ہیں اور آپ کے تھکے ہوئے ننگے پاؤں برفانی ندی کی قربت میں کہ ان پر کچھ چھینٹے بھی برستے جا رہے ہیں.. ٹھنڈک سے گدگدائے جا رہے ہیں اور آپ کھانے کی مستی میں مسکرائے جا رہے ہیں اور اونگھے جا رہے ہیں.. آپ کی پنڈلیوں کے پٹھے تھکاوٹ سے چُور ہیں اور ان کی اکڑی ہوئی

رگیں درد بھی کرتی ہیں اور استراحت کے خمار میں لطف بھی لیتی ہیں..

اسی پُر فضا لنچ سپاٹ میں عمران اور اس کے بغل بچوں نے ہمیں جوائن کرلیا.. وہ ہم سے بات نہ کرتے تھے.. ہم کہتے تھے کہ اچھا تو جھیل پر جب دھوپ پھیلی تو وہ کیسی لگتی تھی اور وہ کہتے تھے "چھوڑو جی.." ہم جو کچھ پوچھتے وہ ناراض ہو کر کہتے "چھوڑو جی.."

"کیوں چھوڑو جی.." میں نے ذرا تلملا کر کہا..

"آپ کو کیا بتائیں کہ آپ نے وہاں نہ ٹھہر کر اپنے آپ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے.. کیا کچھ مس کیا ہے.. اس لیے.. چھوڑو جی" عمران ایک اپنی ہی اونگھ میں تھا.. اس جواب کے بعد میں بھی واپس اپنی اونگھ میں چلا گیا..

جب پورٹر پھر سے سامان کو اپنے کندھوں پر بوجھ کرنے لگے.. ابراہیم کا باورچی خانہ سمیٹا جانے لگا تو یہ گویا نقارہ کوچ کا تھا..

دوبارہ جرابیں اور جوگر پہننا بہت بُرا لگا..

ننگے پاؤں جو سرد اور نشہ آور ہواؤں میں موج کر رہے تھے پھر سے ڈھکے گئے.. آج کی شب ہم نے لوئر شاہی کی بلند چراگاہ میں پہنچنا تھا..

"ابراہیم.." میں نے مغلِ اعظم کی مانند ہو بہو "شیخو" کے انداز میں پکارا..

"جی سر.." وہ اپنے فرائی پین اور دیگچیاں چھوڑ کر حاضر ہو گیا..

"یہ لوئر شاہی کہاں ہے؟"

"وہ سامنے ہے صاحب.." اس نے دریائے ملتر کی اس وادی کے پھیلاؤ کو بالآخر روک دینے والی عظیم چٹانوں اور برفوں کی طرف اشارہ کیا.. اور وہ ابھی بہت دور تھیں "وہ جہاں ایک سرمئی رنگ کی چٹان ہے اور اس کے برابر میں جو چھوٹا پہاڑ ہے وہ سرخ رنگ کا ہے.. نظر آیا ہے صاحب.. تو اس کے برابر میں ذرا اوپر لوئر شاہی کی گھاس ہے.."

بے شک وہ سرخ رنگ کا پہاڑ یہاں سے نظر آ رہا تھا لیکن محض نظر آنا اس بات کی دلیل نہ تھی کہ ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ بھی سکتے ہیں.. پہاڑوں کے فاصلے فریب کے جال ہوتے ہیں..

"چلو چلو لوئر شاہی چلو.." میاں نے اعلان کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر اپنی عینک درست کی "اوئے یہ گدا اور گردآ میز کہاں ہیں؟"

''میاں صاحب وہ تو پیار کے پنچھی ہیں چہکتے ہوئے نکل گئے ہیں'' سلیم ہنسا..

''نہ تو یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟''

''میاں صاحب پیار کے پنچھی تو ہمیشہ تنہائی کے تمنائی ہوتے ہیں..''

''اچھا؟'' میاں قدرے فکرمند ہو گیا ''اوئے پتہ کرو کہیں ان کا ڈیپارٹمنٹ ہی الگ نہ ہو''

ہم چلنے لگے..

دریائے ملتر کا یہ گھاس بھرا میدان اور سپاٹ میدان جلدی ہی ختم ہو گیا اور کنارے اونچے ہو گئے.. ہم بھی ذرا پھسلتے اور کچھ خوفزدہ ہوتے ان کناروں کے ساتھ اونچے ہوتے گئے.. چڑھائی ختم ہوئی تو ایک اور وسیع چراگاہ نظروں کے سامنے پھیلتی گئی جس کے آخر میں مکمل طور پر سلیٹی رنگ کا ایک ویران اور سنسان پہاڑ تھا اور اس کی آغوش میں جو گلیشیئر تھا وہ بھی سرمئی تھا.. گدلی ریت اور کنکروں سے ڈھکا ہوا اور اس میں سے جو گدلا نالہ نکل کر نیچے جا رہا تھا اس کے پانی بھی نیم سیاہ تھے..

پہاڑ.. گلیشیئر اور نالے کے پانی کے رنگ اتنے یکساں تھے کہ وہ مشکل سے الگ الگ دکھائی دیتے تھے.. پانیوں کا بہاؤ بھی سرمئی تھا.. اس منظر کی تصویر میں بس یہی ایک رنگ تھا اور وہ دل میں ایک عجیب بے چینی بھرتا تھا.. اس نالے کو پار کرنے کے لیے ہم چراگاہ سے اوپر اس مقام تک گئے جہاں سلیٹی برف زار میں سے وہ اس رنگ میں رنگا برآمد ہو رہا تھا.. جوں جوں وہ نیچے جا رہا تھا بے لگام اور ناقابلِ عبور ہو رہا تھا.. نالے کے پانی تو سیاہ رنگ کے تھے ہی لیکن اس میں جو پتھر تھے وہ بھی اس کی سیاہی میں ڈوب کر کالک زدہ ہو گئے تھے.. ان پانیوں کو دیکھ کر بدن میں ٹھنڈک کی بجائے ایک سیاہی اُترتی تھی..

نالے کے پار جا کر ہم پھر سے نیچے اُترنے لگے.. ایک فوکر جہاز کی مانند بلندی کم کرنے لگے.. ہم بہت نیچے تک چلے گئے.. آسانی سے نہیں.. ذرا گرتے پڑتے.. اپنے ٹخنے زخمی کرتے نیچے گئے..

اب ہم پر وہ وقت آ چکا تھا جب پہاڑوں میں مسلسل چلنے کی تھکاوٹ اور ایک خوف ہر کوہ نورد کو الگ الگ کر دیتا ہے، تنہا اور خودغرض کر دیتا ہے.. گفتگو اور دوستی یاری موقوف ہو جاتی ہے اور غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ بقیہ لوگ تو جائیں بھاڑ میں.. کم از کم میں تو اس بھربھری بلندی سے لڑھکے بنا نیچے اُتر جاؤں.. یہ بھی اونچے اور نہایت دیوار نما کنارے تھے جن سے چمٹ چمٹ کر ہم

نیچے گئے.. نیچے اُترے ہیں.. تو اپنے سامنے اس سیاہ منظر کو دیکھا جسے ہم نے چراگاہ سے دیکھ تو لیا تھا لیکن ایک کبوتر کے موافق آنکھیں بند کر لی تھیں کہ نہیں.. یہ جو سیاہ پتھروں اور بجری میں بچھے کالے نالے ہیں اور سیاہ آفت متعدد نالے ہیں تو یہ محض ایک منظر ہیں ان کے پار تو ہم نے نہیں جانا.... کسی اور نے جانا ہوگا ہم نے تو نہیں جانا.. اور اگر جانا بھی ہے تو ان کے آس پاس یقیناً کوئی آسان سا راستہ ہوگا..

نیچے اُترے ہیں ان سیاہ آفت بلاؤں کے شور سے کان بہرے ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی اور راستہ نہیں ہے..

سامنے ایک بحرِ اسود ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور تصویرِ مرگ میں مزید سیاہ رنگ بھرنے کے لیے شام بھی ہو رہی ہے..

اب صورت حال یہ ہے کہ سب حضرات ذاتی طور پر بھیگے ہوئے سلیٹی پتھروں اور بجری پر پھسلتے گرتے اِدھر اُدھر اس کاوش میں بھٹک رہے ہیں کہ کہیں نہ کہیں تو یہ نالہ مختصر ہوگا.. اس میں چند پتھر ہوں گے جن پر قدم رکھتے ہوئے ہم اسے ناپ جائیں گے.. لیکن آفرین ہے اس نالے پر کہ اس نے اس قسم کی کوئی سہولت ہمیں مہیا نہ کی.. جہاں وہ ذرا مختصر ہوتا تھا وہاں اُسی حساب سے وہ تیز اور گہرا بھی ہو جاتا تھا.. اور جو پتھر کہیں کہیں تھے وہ اس کی مانند سیاہ تھے اور الگ سے دکھائی نہ دیتے تھے.. چنانچہ ہم نے یہ دلیرانہ فیصلہ کیا کہ اس نابکار کو پورٹروں کی مدد سے پار کیا جائے..

یہ نالہ مجھے یاد نہیں کہ کس کس نے کیسے پار کیا.. البتہ میں نے تین چار پورٹروں کے بازوؤں سے جھولتے اور لٹکتے ہوئے پار کیا..

اس کے بعد ایک اور نالہ تھا..

یہ پہلے نالے کے بڑے بھائی لگتے تھے اور غصے میں لگتے تھے.. میں اُن کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا.. اسے ہم نے.. یا کم از کم میں نے گڈ او لڈ ابراہیم کے کندھوں پر سوار ہو کر پار کیا..

میں اس شام کی نالہ کراسنگ کو بہ طریقِ احسن بیان نہیں کر پایا.. بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہر جانب ہاہاکار مچی ہوئی تھی.. قیامت کا شور تھا اور شام تھی.. ماں بچے کو نہ سنبھالتی تھی صرف گدا.. گرد آمیز کو سنبھالتا تھا کہ سائیں کے چہرے پر بھی ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا اور وہ اپنے کیمروں کو بھی بھول چکا تھا..

اب جو تیسری اور آخری آفت سامنے آئی ہے تو وہ قدرے دھیمے مزاج کی تھی اور میں

جو ابراہیم کے کندھوں پر سواری کرنے کے بعد اپنی عزتِ نفس اور مردانگی کو بُری طرح مجروح کر چکا تھا اسے کچھ بحال کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس ان کے درمیان اُبھرے پتھروں پر اپنے آپ کو بھگوتا.. پھسلتا اسے عبور کرنے لگا.. مسئلہ یہی تھا کہ پانیوں میں جو پتھر تھے وہ بھی اسی رنگ کے تھے چنانچہ کبھی تو آپ ایک بیچ بیچ کے پتھر پر پاؤں جماتے تھے اور کبھی پانیوں کے کسی ابھار کو پتھر سمجھ لیتے تھے اور گھٹنوں تک پانیوں میں چلے جاتے تھے..

میں نے ایک مرتبہ پھر اُن گائیڈ بکس کو کوسا.. اُن حضرات کے خاندانی شجرہ نسب میں کیڑے نکالے جنہوں نے مجھے انفارم کیا تھا کہ ملتر پکھورا ٹریک تو بے حد آسان ہے.. ان تین نالوں کے پار کچھ پتھر تھے.. بڑے بڑے.. ان کے آس پاس بھی پانی بہتا تھا.. ہم نالوں کے شور سے دور ہونے لگے.. شکر کرنے لگے کہ دور ہوتے ہیں اور وہ سرخ ڈھلوان جس کے دامن میں لوزر شاہتی تھا قریب آنے لگی..

چڑھائی پھر سے شروع ہوگئی..

بائیں جانب یکدم کچھ برف سے ڈھکی چٹانیں اور گلیشیئر قریب آنے لگے اور ہاں ان سیاہ آفت پانیوں کے کناروں پر.. انہیں عبور کرنے کی جان لیوا کوششوں میں جب ہم تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نہ ان سے ڈرے نہ پیچھے ہٹے نہ ذرہ بھر خوفزدہ ہوئے بلکہ وہ تو قہقہے لگاتے جشن مناتے تھے اور یہ عمران تھا اور اس کے بغل بچے تھے جو کیمرے کاندھے پر لادے.. بیٹریوں کا بوجھ اٹھائے.. تاریں بچھاتے.. مائیک کا منہ کھولے ان سیاہ عفریتوں کو بے خوفی سے پھلانگتے بندروں کی طرح ان پر سے کودتے.. لدھڑوں کی مانند پانیوں کی قربت میں اُچھلتے.. ہم سب کی بے بسی اور خوف کو فلم بند کرنے میں مشغول رہے.. یہ لوگ بخشے جانے والوں میں کبھی شمار نہ ہوں گے..

شام میں ڈھلتی شام ہوتی سرمئی ندیوں کی وادی نیچے رہنے لگی اور ہم ہانپتے ہوئے بلند ہونے لگے.. سُرخ مٹی کی پہاڑی قریب آ رہی تھی..

لوزر شاہتی کی چراگاہ کی بس جھلک نظر آنے لگی اور وہاں جو ابھی کچھ دیر پہلے دھبے سے تھے وہ ہولے ہولے حرکت کرنے لگے کہ یہ وہ مویشی تھے جو اس چراگاہ میں عیش کرنے کے لیے آئے تھے.. بابر بہ عیش کوش کہ یہ گھاس دوبارہ نیست.. اور شائد اُس لمحے وہ ہمیں بھی سیاہ پانیوں اور سرمئی چٹانوں کی وادی میں سے بلند ہو کر ایک مختصر پگڈنڈی پر ہانپتے ہوئے حرکت کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور انہیں حیرت ہوتی ہوگی کہ یہ کیسے مویشی ہیں جو گھاس نہیں چرتے بس گرتے پڑتے

ہماری جانب آتے چلے جاتے ہیں..

کہیں بلند پہاڑوں میں شام بھی یکلخت اُترتی ہے.. بلکہ گر پڑتی ہے.. ابھی وہ گری نہیں تھی.. اُتر رہی تھی.. ہم سب تھکاوٹ کے بوجھ میں خاموش.. کوہ نوردی کے جرم کی سزا بھگتتے ہوئے اُس پگڈنڈی پر چلتے جا رہے تھے جب اُس شام کے سکوت میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی.. ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی اس میں ایک کپکپاہٹ تھرانے لگی.. جیسے ایک سانپ جان جاتا ہے کہ اس کے نیچے جو زمین ہے اُس میں ایک دھمک ہے اور کوئی دشمن آس پاس ہے ایسے ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی وہ کچھ خبر کرتی تھی.. پھر جیسے ایک نومولود زلزلے کے آثار لرزنے لگے.. کچھ پتھر گرے.. جھاڑیوں کے پتے ہلنے لگے اور ہم تھم گئے..

ابراہیم بھی رُک گیا اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا "صاحب احتیاط کرو.. اوپر سے یاک آ رہا ہے.."

ہم جو احتیاط کے مارے پگڈنڈی سے نظریں نہیں ہٹاتے تھے.. ہم نے نظریں ہٹا کر اوپر بلندی کی جانب نگاہ کی تو اس خوفزدہ نگاہ نے دیکھا کہ وہاں سے دھول اڑاتے دھولیں مچاتے.. ہماری موجودگی سے بے پرواہ، متعدد زلزلے نیچے آ رہے ہیں.. ان میں کوئی تو بھورے رنگ کا تھا.. تو کوئی چتکبرا.. کوئی بالکل سیاہ تو کوئی سراسر سفید.. آپس میں بھڑتے.. درجنوں یاک پھنکارتے بلندی سے نیچے آ رہے تھے اور ہم سب اُن کے راستے میں تھے.. یاکوں کا ریوڑ براہ راست ہمیں روندنے کے لیے دھول اُڑاتا.. دھومیں مچاتا نیچے آ رہا تھا..

سیدھا ہماری جانب اُترتا آ رہا تھا..

اور وہ صریحاً موت تھے..

اُن کے سُموں کی دھمک سیاہ ندیوں کے شور سے کہیں بڑھ کر ہولناک تھی..

اُس لمحے مجھے خیال آیا کہ یہ تو نہایت زیادتی ہوگی کہ میں ورگوتھ کے سفید نالے پار کر جاؤں.. بیافو ہسپر کے قاتل گلیشیئر عبور کر جاؤں.. شاہ گوری کو ہاتھ لگا آؤں اور مجھے کچھ نہ ہو اور پھر یہاں لوزر شاہتی کے قریب بلندیوں سے بے قابو اُترتے ہوئے یاکوں کے نیچے آ کر کچلا جاؤں.. یہ تو نہایت زیادتی ہوگی.. سنولیک کی کسی دراڑ میں گر کر ہلاک ہو جانا کسی حد تک رومینٹک ہوتا لیکن یاکوں تلے آ کر ہلاک ہو جانا تو نہایت نامناسب اختتام ہے..

چونکہ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا اس لیے ہم سب گم صُم کھڑے تھے.. بت بنے دم بخود

کھڑے تھے کہ اب تو جو مزاج یاک میں آئے.. اور ہم میں سے کون ہے جو کچلا جائے گا اور کون ہے جو بچ جائے گا اس کا فیصلہ اگلے چند لمحوں میں ہو جانا تھا..

یاک سیدھے ہماری جانب لڑھکتے آ رہے تھے اور جب وہ اتنے قریب آ گئے کہ ہم ان کی آنکھوں میں آنکھیں اور اگر ہماری بھی مورچھل نما دُمیں ہوتیں تو دُموں میں دُمیں ڈال کر دیکھ سکتے تھے.. لیکن ہم نے انہیں زیادہ دیر نہ دیکھا کیونکہ ان کے سُموں سے اُٹھنے والی دھول ہماری آنکھوں میں جھونکی گئی.. کچھ دکھائی نہ دیا.. وہ افریقہ میں کسی دہشت کے باعث ظہور پذیر ہونے والی جانوروں کی بھگدڑ کی طرح ہمارے آس پاس سے گزر گئے اور نیچے چلے گئے.. جب گرد چھٹی تو ہم نے دیکھا کہ وہ سیاہ ندیوں کے کناروں تک پہنچ چکے تھے..

یہ منظر اور یہ وقوعہ یقیناً دہشت ناک تھا.. یہاں تک کہ پورٹر بھی پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں دُبکے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک المناک خوبصورتی تھی..... اس ڈھلوان اور بلند چراگاہوں کی شام میں ان یاکوں کا پہاڑوں سے دھول اڑاتے لڑھکتے آنا.. اس میں بھی ایک گُنگ کر دینے والا حُسن تھا.. کسی بھی شے کے حُسن کا معیار اس کے کم کم ہونے اور یکتا ہونے میں ہوتا ہے.. جہاں کہیں اس کی بہتات ہوتی وہیں اس کی بے قدری بھی ہوتی.. یورپ میں گوری رنگت دل نہیں روکتی کہ وہ عام ہے.. ایک نیوڈ بیچ پر برہنگی آپ کو ہیجان میں مبتلا نہیں کرتی کہ وہ کھلے عام ہے.. نمائش پر ہے اور بہت ہے.. البتہ ادھر پنجاب میں وہی گورا رنگ ہو تو اس کے گیت گائے جاتے ہیں اور گورا رنگ نہ دینے کی دعائیں کی جاتی ہیں نہیں تو پورا پنڈ ویری ہو جاتا ہے.. چنانچہ حُسن کا اور منظر کا بھی معیار اس کے کم کم ہونے میں ہے..

تو اس منظر میں.. سرِ شام.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. سرد گلیشیئر ہواؤں اور جنگلی بوٹیوں کی تیز مہک میں درجنوں یاکوں کا پہاڑوں سے اُترنا.. دھول اُڑاتے.. آپس میں بھڑتے.. آپ کو روند دینے کا امکان رکھتے.. یوں نیچے آنا بھی ایک بے مثل خوبصورتی والا ڈرامہ تھا..

اس لیے کہ صرف ہم نے اُسے دیکھا تھا.. بلکہ میں نے اُسے دیکھا تھا کیونکہ ان درجنوں یاکوں میں سے ایک یاک ایسا تھا جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا.. کہیں ملاقات ہوئی تھی..

جب میں دم روکے کھڑا تھا اور وہ بے اختیار نیچے آتے ہوئے اپنے سموں کی لرزش میرے بدن میں بھرتا قریب آیا تھا تو.. اس نے بھی مجھے دیکھا تھا..

اور اس یاک کے دماغ میں بھی یہی اُلجھن تھی کہ اس خوفزدہ بندے کو میں نے پہلے بھی

کہیں دیکھا ہے..

دیوسائی کے میدان میں خیمہ زن.. وادیٔ روپل میں یا وادیٔ بروغل کی یاک سرائے میں.. یا پچھلے برس وادیٔ شمشال میں.. کہیں نہ کہیں اس بندے کو دیکھا ہے.. اور یہ بندہ باز نہیں آتا.. پھر آ جاتا ہے کہیں نہ کہیں..

اس یاک کے گھنے ہوئے بدن سے برگد کی داڑھیوں کے مانند لٹکتے گھنے کھردرے بال.. کہیں سیاہ تھے اور کہیں برف سفید.. دُم خوب گھنی اور مورچھل نما تھی.. اگر وہ یاک یہ سوچتا تھا کہ یہ شخص پھر آ گیا ہے..

تو میں بھی یہی سوچتا تھا کہ یہ یاک پھر آ گیا ہے..

''ہمہ یاراں، ایسی بلندی.. ایسی برفیں.. اور ایسی چراگاہ.. لوئر شاہنی.. سبحان اللہ''

لوئر شاہنی ہماری آمد سے آباد ہو گیا تھا..

یہاں میلے کا سا سماں تھا..

جہاں ایک ڈھلوان اُترتے اُترتے ہموار ہوتی تھی.. چند پتھر تھے گھاس میں ڈھکے ڈھکے.. ایک مختصر چراگاہ تھی.. اور پھر ایک کنارہ بلند ہوتا تھا جس کے عین نیچے ایک گلیشیئر کا وجود اپنی سفید شان اور تمکنت میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس گلیشیئر کے پار اس برف کے جمے ہوئے دریا کے دوسری جانب برفوں سے ڈھکے چُپ کھڑے.. نہایت سرد ہوتے پہاڑ تھے جو بے حد ویران تھے..

کہیں بلند پہاڑوں میں پوشیدہ اس نا آشنا مقام میں میلہ لگا تھا..

ہمارے ٹینٹ لگے تھے..

الاؤ روشن ہو رہا تھا..

چولہے میں آگ جل چکی تھی اور اس کی لَو میں ابراہیم کا سفید چہرہ دمکتا تھا.. اور سردی تھی.. اور بہت تھی..

چراگاہ میں جب ہم وارد ہوئے.. ابھی ابھی یاکوں کی دہشت میں لرزتے بدن کے ساتھ تو وہاں دو تین آوارہ قسم کی گائیں چرتی تھیں جنہیں ہم نے شُوشُو کر کے بھگا دیا تھا کہ تم کہیں اور چلی جاؤ.. تم تو یہاں آتی ہی رہتی ہو.. ہم اِدھر پہلی بار آئے ہیں.. مسافر ہیں آج ایک شب گزار کر کل چلے جائیں گے.. اور وہ ایسی شرمیلی گائیں تھیں کہ پہلی شُو پر انہوں نے اُدھر کا رخ

کر لیا جدھر بپھرے ہوئے یاک اُترے تھے..

میں اپنے خیمے میں جا کر ابھی لیٹا ہی تھا.. کمر ابھی مکمل طور پر سیدھی نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ گرم پانی میں ڈیٹول کے چند قطرے ڈال کر اپنی رانوں پر آئی ہوئی خراشوں کو اس سے دھولوں.. اور آج کل کی نسبت میں کم زخمی ہوا تھا.. تو ابھی اسی قسم کے ناآسودہ سے حالات تھے جب ابراہیم نے خیمے کے پردے میں سے جھانک کر قدرے ہچکچاہٹ سے کہا ''صاحب آپ تھک گیا ہے.. ہم آپ کو دباتا ہے''

''نہیں..''

''نہیں صاحب.. مہمان تھک جائے تو ہم اسے دباتا ہے.. ہمارا فرض ہے..''

''یاک سرائے'' کے سفر کے دوران تگیر خان نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا.. یہ ایک زمانے میں آدابِ میزبانی میں شامل تھا کہ اگر ایک مہمان پہاڑوں میں سفر کرتا کہیں برفوں کے کناروں پر بنے آپ کے جھونپڑے تک پہنچتا ہے تو ظاہر ہے اس کا بدن ٹوٹ رہا ہو گا تو پہلے اسے دباتا ہے اور پھر خوراک پیش کرتی ہے.. اور یہ دستور اب تک چلا آتا ہے..

پنجاب کے دیہات میں بدن دبانا.. مٹھی چاپی کرنا روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا.. گاؤں میں مہمان آتا تھا تو سب سے پہلے کسی ملازم یا کسی کو اس کی تھکاوٹ اُتارنے کے لیے بدن دابنے پر معمور کر دیا جاتا تھا چوہدری صاحب کے کندھے دابنے کے لیے کوئی نہ کوئی شخص ہمہ وقت ڈیوٹی پر رہتا تھا ادھر چوہدرانی صاحبہ کے بھی یہی معمولات تھے کہ نائن یا میراثن ان کے کولہے اور کندھے دابنے میں مشغول ہے.. لاہور شہر میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ نارمل روٹین تھی کہ پرانی فصیل کے گرد جو باغات ہوا کرتے تھے وہاں سرِ شام معززین لنگوٹ باندھ کر اپنے آپ کو دبواتے تھے اور مالش کرواتے تھے.. میری بیگم جو بنیادی طور پر ایک شہرن تھی جب شادی کے فوراً بعد میرے گاؤں گئی تو اسے شدید شکایت ہوئی کہ وہاں تو جو بھی خاتون ملنے کے لیے آتی تھی سر پر پیار دے کر مجھے دبانے لگتی تھی کہ وہ نئی تھک گئی ہو گی اور مجھے تو بڑی شرم آتی تھی.. میرے اباجی کا بھی فیورٹ پاس ٹائم یہی تھا کہ کاروبار سے واپس آتے، اپنا تھری پیس سوٹ اتارا.. ہیٹ کھونٹی پر ٹانگا اور تہمد اور بنیان زیبِ تن کر کے پلنگ پر لیٹ گئے اور ہم سارے بہن بھائی جن کا کل وزن ان کی نسبت آدھا بھی نہ تھا ان پر چڑھ کر اُچھل کود کرنے لگے.. اور وہ خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے..

اب ہم متمدن یافتہ ہو گئے ہیں اور کسی کو اپنا بدن چھونے تک نہیں دیتے البتہ مساج

کروانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور فزیوتھراپی کے لیے زرِ کثیر خرچتے ہیں.. تو جب ابراہیم نے مجھے دبانے کی پیشکش کی تو میں نے ایک واجبی سی "نہیں" کے بعد قبول کر لی کیونکہ میرا بدن تو ایسا تھکا ہوا تھا کہ اسے اگر مٹی میں بھی دبا دیا جاتا تو میں اعتراض نہ کرتا..

ابراہیم کی ایکسپرٹ مٹھی چاپی نے مجھے بحال کر دیا.. اگرچہ اس نے پہلے میرے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک ایک کر کے گرفت میں لیا اور ان میں پٹاخے نکالے پھر پاؤں کو دوہرا کر کے اس کے کڑاکے نکالے اور پھر کمر پر متعدد گھونسے رسید کر کے مجھے اَدھ موا کر دیا لیکن بحال کر دیا.. اب میں اسے بار بار کہتا ہوں کہ بس ابراہیم کافی ہے اور خواہش یہی ہے کہ یہ بس نہ کرے کہ اس عمل سے جو راحت حاصل ہو رہی تھی اور جو تھکاوٹ اُتر تی تھی اس کا بیان ممکن نہیں..

"بس ابراہیم.. تھینک یو" میں نے بالآخر دل پر جبر کر کے اُسے روک دیا..

"آپ مہمان ہیں صاحب.." وہ کہہ کر خیمے سے نکل گیا..

علی تجھیل کی خیمہ گاہ بُری نہ تھی بلکہ خاصی خوش نظر تھی لیکن اس نے مجھے مایوس کیا تھا کہ وہ پتھروں اور درختوں میں دم روکے ہوئے تھی.. دِکھی چھپی تھی لیکن لوئر شاہنی کی اس بلندیوں کے تحت پر براجمان کھلی برفوں اور آسمان کی قربت میں سانس لیتی آماجگاہ نے مجھے مسحور کر دیا تھا..

بس یہی زندگی تھی..

یارو یہی زندگی ہے..

سرد ہوائیں اگرچہ بہت مدھم بے آواز.. لیکن ایسی کہ ان میں لوئر شاہنی کے نیچے لیٹے گلیشیئر کی برف کی کرچیاں گویا ہم تک آتی تھیں اور رخساروں کو چھوتی تھیں.. برف بوسے ہم سے پیار کرتے تھے.. آوارہ گردی کا کھوتا سکہ یہاں کھرا ہوتا تھا.. چلتا تھا.. بدنی زوال اور عمر معدوم ہوتی تھی.. اور.. آپ کو ایک انوکھے راز میں شریک کرتا ہوں جنیوا کی میونسپل کیمپنگ میں میرے اولین خیمے میں رتھ کی جو مہک تھی.. اور کتنے برس پیشتر؟.. شاید چالیس برس ہونے کو آئے.. تو وہی مہک آج بھی کتنے زمانوں کے بعد میرے خیمے میں تھی.. اگرچہ رتھ کی نہ تھی..

شاہ گوری کی تھی جس کے گورے برف بدن پر نیل تھے..

تجھیل کر ومبر کے پانیوں کی نمی کی تھی..

اُس بوٹے کی تھی جو زمین سے پھوٹا لیکن جڑیں پکڑنے سے پہلے بہہ گیا.. میں اب اُس انوکھے راز کی طرف آتا ہوں.. میں اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایک غیر معمولی حسی تجربہ شیئر

کرنا چاہتا ہوں.. جیسے ایک طوائف اور ایک شریف زادی کے تجربوں میں فرق ہوتا ہے.. ایک درویش اور ایک دنیادار کی حسیات الگ الگ ہوتی ہیں.. جو کچھ ایک بدن ایک رُوح پر بیتتی ہے وہ کسی دوسرے بدن دوسری روح کے نزدیک ناممکن کی فہرست میں درج ہوتی ہے.. کچھ اسی طور ایک آوارہ گرد کے حسی تجربے غیر معمول کے اس ضمن میں آتے ہیں جنہیں ایک معمول کی زندگی گزارنے والا دیوانگی میں شمار کرتا ہے.. مجھ پر ایک ایسا وقت تھا کہ میں جناح باغ لاہور میں ایک باقاعدہ.. آندھی ہو بلاخیز بارش ہو.. طوفان درختوں کو جڑوں سے اُکھاڑ رہا ہو.. پھر بھی ایک باقاعدہ اور نشئی قسم کا سیریا ہوا کرتا تھا.. صبح کی اس روزانہ سیر کے دوران ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی جو یوگا پر دسترس رکھتے تھے.. چلتے پھرتے بالکل نہیں تھے ایک ہی مقام پر اُلٹے سیدھے ہو کر سر کے بل کھڑے ہو کر اور آسن جما کر فارغ ہو جاتے تھے.. اور بے حدفٹ تھے.. میں کچھ دنوں یوگا میں ان کا مرید ہوا لیکن میرے بدن میں اور دماغ میں وہ طمانیت اور لچک پیدا نہ ہو سکی جو یوگا کا خاصا ہے پھر بھی کچھ کچا پکا کام سیکھ لیا.. ایک دو آسن سیکھ لیے.. کچھ گُر حاصل کر لیے.. ان میں سے صرف ایک نے میرا ساتھ دیا.. وہ یہ کہ سیر کے بعد جب آپ کا بدن تھکا ہوا ہوتا تھا.. اگرچہ ایک پھول کی مانند تازگی میں چلبلاتا بھی تھا تو آپ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اپنا سانس اندر کو کھینچتے ہوئے اپنے سر کو آہستہ آہستہ جہاں تک ہو سکے پیچھے لے جاتے ہیں اور پھر دم روکے وہیں ٹھہر جاتے ہیں جب تک آسانی سے اس حالت میں رہ سکتے ہیں رہتے ہیں اور جب چہرہ سرخ ہونے کو آتا ہے.. سانس سہارا نہیں جا سکتا تو آپ دھیرے دھیرے اس سانس کو خارج کرتے ہوئے سیدھے ہو جاتے ہیں.. سیدھے ہونے پر ایک تو آپ بری طرح لڑکھڑا جاتے ہیں جیسے نشے میں بے اختیار ہوں اور اسی لیے یہ ورزش کسی بنچ یا پتھریلی سطح کے قریب نہیں کریں تاکہ گر جانے کی صورت میں زخمی نہ ہوں.. تو جونہی آپ لڑکھڑا کر سیدھے ہوتے اپنے آپ کو سنبھالتے ہیں تو ایک تبدیلی ظہور پذیر ہوتی ہے آپ کے حواس کی کئی ایسی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں جو مدت سے بند پڑی زنگ آلود ہو چکی تھیں.. حیرت انگیز طور پر آپ کی بینائی بڑھ جاتی ہے.. نظر تیز ہو جاتی ہے اور وہ اشیاء جو آؤٹ آف فوکس تھیں فوکس میں آ جاتی ہیں.. گھاس کی ہر پتی.. ہر برگ.. اور اس پر اوس کی ہر بوند ایک ہیرے کی مانند دمکتی اور اس ہیرے میں جو چمکتی کرچیاں ہیں وہ بھی الگ الگ.. اگر اس لمحے کوئی پرندہ نظر کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ اتنے سلوموشن میں گزرتا ہے کہ اس کے پر بھی گنے جا سکتے ہیں.. ایک عجیب سی سنسنی بدن میں تیرنے لگتی ہے.. لیکن یہ سب کچھ پل دو پل کا

کھیل ہوتا ہے.. ایک دوبارہ آنکھیں جھپکنے کی دیر ہے کہ زائل ہو جاتا ہے.. وکیل صاحب کا کہنا تھا کہ ان چند لمحوں میں آپ جو کچھ بھی اپنے خیال میں لے آئیں مکمل توجہ کے ساتھ.. جس چہرے یا جس منظر کو ذہن میں لائیں تو وہ زندہ ہو کر آپ کے حواس پر اثر انداز ہونے لگے گا. تو ان دنوں ایک بار جب میں اس یوگا ورزش کے بعد سانس کو آہستہ آہستہ خارج کرتا سیدھا کھڑا ہوا.. قدرے چکرایا تو یکدم جنیوا میونسپل کیمپنگ سے نیچے آتے ہوئے دریائے رہون کے اوپر جو راستہ تھا جس کے کناروں پر درختوں کی ٹہنیوں کی ایک حفاظتی باڑھ تھی اور اس باڑھ سے لگ کر.. میری جانب چہرہ کئے زتھ کھڑی ہوئی تھی اور میں اسے دریا کے سرد پس منظر میں دیکھ رہا تھا تو وہ ایک لمحہ یوں زندہ ہوا کہ ان چند ساعتوں میں نہ صرف میں دریائے رہون کا شور سن رہا تھا بلکہ زتھ کے گلے میں جو لاکٹ تھا اور جیسے وہ اس کے بدنی ابھار پر ادھر اُدھر ہوتا تھا اس کے سانس لینے سے اُسے دیکھتا تھا.. اور حیرت در حیرت کہ اس روز.. چالیس برس پیشتر اس کے بدن پر جو سینٹ لگا تھا اس کی مہک بھی واضح طور پر میرے نتھنوں میں آتی تھی.. اب میں نہیں جانتا کہ یہ محض میرے تصور کا کرشمہ تھا.. کوئی شعبدہ بازی تھی یا کیا تھا لیکن ایسا ہوا.. اگر یہ صرف تصور کی شعبدہ بازی تھی تو یہ بھی جنم لیتی تھی جب میں یوگا کی وہ ورزش کرتا تھا.. میں اب بھی سیر کے بعد یہی عمل کرتا ہوں..

میرے سیر کے ساتھی مجھے ہر صبح شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب میں سانس خارج کرتے ہوئے سیدھا ہوتا ہوں اور مسکرانے لگتا ہوں اور آمد آفتاب سے پہلے کے سرخ ہوتے آسمان میں سے گزرتے کسی پرندے کو دیکھتا ہوں اور نہ صرف ماضی کو یاد کرتا ہوں بلکہ اپنے لیے.. اپنے بچوں کے لیے اور اپنے پیاروں کے لیے ہاتھ جوڑ کر دعائیں بھی کرتا ہوں اور جب میرے دوست پوچھتے ہیں کہ چوہدری صاحب یہ آپ سورج دیوتا کی پرستش کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہاں چند لمحوں کے لیے ہر شخص وقتی طور پر ابراہیم ہو جاتا ہے.. تو اس شب.. لوئر شاہجی کی نامعلوم بلند برفانی چراگاہ میں.. اپنے خیمے میں.. واضح طور پر شاہ گوری کے بدن کی مہک میرے نتھنوں کو مہکاتی تھی.. اور وہ کبھی میری انگلیوں کی پوروں میں سے پھوٹتی تھی اور میں انہیں ناک سے لگا کر اس کی موجودگی محسوس کرتا تھا.. اور کبھی ایسا لگتا تھا کہ شاہ گوری کا انجماد میرے بدن کی گرمی سے پانیوں میں بدلتا ہے.. اور وہ سرد نہیں بلکہ نیم گرم اور مہک زدہ ہو کر میرے سلیپنگ بیگ کو گیلا کرتے ہیں..

یہ سب کچھ اپر شاہجی میں.. کہیں بلند برفوں کے دامن میں میرے خیمے میں ہو رہا تھا..

برسوں پہلے جو بوسے میرے وجود پر اترے تھے وہ میرے بدن کی مٹی کو گیلا کر رہے تھے اور سوکھی پیاسی مٹی پر گرنے والی بارش کی پہلی بوند کی مانند مجھے مہکا رہے تھے.. اور اس لمحے ایک زبردست اینٹی کلائمکس ہوا..

سلیم دانت نکالتا.. بے دریغ اور بے تکلف مجھ سے اجازت طلب کئے بغیر میرے خیمے میں دندناتا ہوا آ گیا..

اور میں اپنے ہی وہم اور اپنے ہی خیالوں میں تھا تو میں نے نہایت ناگواری سے کہا ''جی فرمایئے''

''فرمایئے کیا؟'' وہ ٹھٹک گیا..

''آپ کس سلسلے میں یوں دندناتے ہوئے میرے خیمے میں چلے آ رہے ہیں؟''

''چلا جاتا ہوں'' اس نے قطعی طور پر بُرا مانے بغیر جواب دیا.. اور جانے کو ہوا..

''سوری..'' میں نے معذرت کی.. ''لیکن خیریت ہے؟ کس سلسلے میں آئے تھے؟''

''ویسے میں تو اسی سلسلے میں آیا تھا کہ یہ خیمہ میرا ہے.. آپ کہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں.. نو پرابلم..''

اور میں فوری طور پر وہم اور گمان کی وادیوں میں سے نکل آیا اور نہایت خجل اور شرمندہ ہوا.. دراصل اس ٹریک کے لیے میں اپنا ''پاک سرائے'' خیمہ جو تنگ نما خیمہ لایا تو تھا لیکن اس کی ایستادگی میں جو پیچیدگیاں تھیں اور پھر اس میں اُلٹے پاؤں اپنی پشت کی نمائش کرتے ہوئے اس میں داخل ہونے کی جو شرمندگیاں تھیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سلیم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ٹریک کے دوران مجھے اپنے قدرے کشادہ اور کم پیچیدہ خیمے میں فروکش کر لیا کرے.

خیمہ اُس کا تھا اور میں پوچھ رہا تھا کہ تم کس سلسلے میں یہاں آئے ہو..

''سوری پرنس.. میں ذرا تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور خواب و خیال کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا.. تمہارا اپنا خیمہ ہے.. چلے آؤ..''

''سر مجھے شرمندہ تو نہ کریں'' وہ سچ مچ شرمندہ ہونے لگا'' میں چلا جاتا ہوں..؟''

''بیٹھ جاؤ..''

''بیٹھ گیا سر..'' وہ مسکراتا ہوا.. میری فاترالعقلی کو سمجھتا ہوا.. مسکراتا ہوا بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی نہایت سنجیدہ ہو گیا اور پوچھا ''عشق کیا ہے سر؟''

"میں ابھی وہیں تھا جہاں عشق ہے.."

"اور اب کہاں ہے؟"

"اب وہاں نہیں ہے جہاں تھا.. تمہاری آمد سے اس کی لٹیا ڈوب گئی ہے.."

"اگر میرے جانے سے عشق کی لٹیا تیر سکتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"بیٹھے رہو.."میں اس کے لاڈ پیار سے لطف اندوز ہو رہا تھا" کیا خبریں ہیں؟"

"خبر یہ ہے کہ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ ندیوں اور جھیلوں کا پانی آپ کو موافق نہیں آیا.. آپ کے پیٹ میں گڑ گڑ ہوتی ہے.. معدہ اسے قبول نہیں کرتا تو میں اپنے ساتھ اسلام آباد سے منرل واٹر کی چند بوتلیں لے کر آیا ہوں.. میں وہ پیش کر سکتا ہوں" کیا آپ پسند فرمائیں گے؟"

"مجھے منرل واٹر ہمیشہ سے پسند ہے.. خاص طور پر کہیں بلند پہاڑوں میں.. پیش کیا جائے"

سلیم نے پیش کر دیا..

اس عام سے منرل واٹر کی تاثیر بھی الگ تھی.. اس پانی نے اپنی میدانی خصلت ترک کر دی تھی اور بلندی کی وجہ سے کہ یہاں آکسیجن کم تھی پُر خمار ہو گیا تھا..

جیسے بلندی پر پی جانے والی لسی.. پاک سرائے کے راستے میں یا فیری میڈو کے راستے میں.. محض لسی ہوتی ہے اور جب اسے میدانوں میں لاہور کے رائل پارک کے بھادی پہلوان کی دوکان کے باہر کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے تو اس میں خمار آ جاتا ہے..

"میں نے کہا پہلوان جی.. یہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے" میاں صاحب بھی وارد ہو گئے اور ہم سے اجازت لیے بغیر ایک کونے میں فروکش ہو گئے..

ان کی غیر متوقع آمد سے خیمے میں شاہ گوری کی جتنی بھی مہک باقی تھی وہ بھی فی الفور کافور ہو گئی..

میاں صاحب بس ایسی ہی پرسنیلٹی تھے کہ یا تو وہ رہ سکتے تھے اور یا شاہ گوری.. وہ نہ صرف فروکش ہو گئے بلکہ بولنے بھی لگے" تارڑ صاحب.. جناب کیا جبر جنگ کیمپنگ سائٹ ہے.. آپ نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں.. آتے ہی خیمے میں گھس گئے ہیں اور تب سے اپنی رانوں کو تیل سے چوپڑ رہے ہیں اور خراشوں پر ڈیٹول لگا رہے ہیں.. یا ابراہیم سے مٹھی چاپی کروا رہے ہیں.. باہر آ کر دیکھیں تو سہی کیا نظارے ہیں.."

"کیا نظارے ہیں.. آپ بیان کر دیں.. رنگ میں بھنگ ڈالنے میں آپ کا جواب نہیں تو آپ بتا دیں کہ باہر کیا نظارے ہیں.."

"جناب عالی.. یوں سمجھ لیں کہ ہم ایک بلند ہرے بھرے اور پھولوں بھرے تخت پر براجمان ہیں.. ذرا اوپر دیکھو تو برفیں ہی برفیں.. اور اس خیمے سے باہر آ کر دیکھو تو نیچے ایسا نامہ نیم گلیشیر ہے.. ایسا گلیشیر ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے ڈر سے روح قبض ہوتی ہے.. اور اس کے پیچھے جو پہاڑ ہیں تو گویا برف کے انبار ہیں.. ویسے یہاں آپ اور سلیم کیا گڑبڑ کر رہے ہیں.. کیا کھا پی رہے ہیں؟"

"ہم منرل واٹر پی رہے ہیں.." میں نے بھنا کر جواب دیا..

اتنی دیر میں شاہد کا سفید چرا ہیٹ بھی زبردستی خیمے کے اندر نازل ہو گیا.. وہ خود تو دکھائی نہ دیا صرف ایک ہیٹ اور سیاہ چشمہ اندر آ گیا".. اجازت ہے؟"

"تشریف لے آئیے"

"ویسے میں آپ حضرات کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا.."

"کر بھی رہے ہوں تو کون پرواہ کرتا ہے.. آپ آ جائیے"

"ویسے اگر کوئی پرائیویٹ کام ہو رہا ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"نہیں نہیں شاہد بھائی آپ تشریف لے آئیں.."سلیم نے بھی درخواست کی..

"نہیں اگر آپ کہتے ہیں تو.. میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا.." اس کا سفید پلپلی ہیٹ اور سیاہ چشمہ وہیں معلق رہا..

"اوئے شاہد.. تو سیدھی طرح اندر آتا ہے کہ میں تجھے ایک ٹھسن پھیروں.." میاں صاحب کی طاقت برداشت جواب دے گئی..

"میاں صاحب تشدد کرنے کی کیا ضرورت ہے میں حاضر ہو جاتا ہوں.. کیوں مائی لیڈر اجازت ہے.."

شاہد بھی ایک کونے میں سمٹ گیا..

کچھ دیر ہم چپ بیٹھے رہے.. گفتگو کا تانا بانا بکھر گیا تھا.. اس خاموشی کے دوران خیمے کے باہر سے ایک شرمیلی جھینپی مسکین سی آواز آئی" سر جی میں بھی اندر آ جاؤں.. باہر اکیلا رہ گیا ہوں".. یہ حسن صاحب تھے..

کورم پورا ہو گیا..

حسن صاحب بھی سارا دن برفانی ندیوں کے پانی پیتے رہے تھے اور یہ پانی حلق میں کڑواہٹ بھرتے ہیں اور گلا سکھاتے ہیں اس لیے انہیں بھی میدانوں کا منرل واٹر پیش کیا گیا..

انہوں نے دو تین گھونٹ بھرے تو ان کا حلق تر ہو گیا اور وہ بولنے لگے ''کیا بات ہے سر جی..''

''کونسی بات' کیا بات ہے حسن صاحب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا..

''کوئی سی بھی بات ہو تو وہ بات کیا بات ہے سر جی..''

''ہیں جی؟'' میں مزید حیران ہوا..

''آ ہو جی..'' حسن صاحب مزید پُرمسرت ہو گئے..اُن پر واضح طور پر بلندی کا اثر ہو چکا تھا..

''لیکن جناب..'' شاہد نے شرارت بھرا ایک کھنگورا مارا ''آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے تھے..''

حسن نے شاہد کے سوال پر کان نہ دھرا اور مجھی سے مخاطب رہے ''کیا بات ہے سر جی..کیا کیمپنگ ہے''

''حسن صاحب'' شاہد نے پھر انہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ''میں پوچھ رہا تھا کہ آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے..''

''کیا بات ہے..'' حسن نے نہایت شانت لہجے میں کہا..

شاہد اشتعال میں آ گیا ''جناب من میں پوچھ رہا ہوں کہ..آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے تھے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ کیا بات ہے..''

''شاہد صاحب'' حسن نہایت دھیمے لہجے میں بولا ''کوئی بات ہے تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیا بات ہے..تو آپ کیا بات کر رہے تھے؟''

''میں سر بکواس کر رہا تھا آپ مجھے معاف کر دیں'' شاہد نے ہیٹ اتار کر اپنے چند بال نوچنے کے بارے میں سوچا اور پھر یہ ارادہ ترک کر دیا..

''نہیں نہیں شاہد جی آپ بتائیں تو سہی کہ کیا بات کر رہے تھے..''

مجھے اب خدشہ ہوا کہ شاہد اپنے بال نوچنے سے باز نہیں آئے گا اس لیے میں نے دخل اندازی کر دی'' یہ پوچھ رہا ہے کہ آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے؟''

''چلیے میں جھک مار لیتا ہوں..بتائیے'' شاہد نے زبردستی اپنے آپ کو پُرسکون کیا

''ہاں..تو اکیلا میں اس لیے رہ گیا کہ عمران، طاہر اور کاظمی یہاں پہنچتے ہی سگرٹوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ان کو دوبارہ بھرنے لگے اور کیمپنگ سائٹ سے دور ہو کر تخلیے میں دھواں اڑانے لگے..اور ابھی تک قہقہے لگا رہے ہیں..گدا اور گرد آ میز نے بھی اپنا خیمہ ہم سے ذرا فاصلے پر لگایا ہے اور وہ دونوں جوں اندر گئے ہیں ابھی تک باہر نہیں آئے تو یوں میں باہر اکیلا رہ گیا..''

''تھینک یو حسن صاحب..'' شاہد گفتگو سے ریٹائر ہو گیا..

''ویسے تارڑ صاحب..'' میاں صاحب نے عینک درست کی اور شکایت آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے ''اس ٹریک میں ابھی تک کوئی پُشت پار مزا نہیں آیا..کچھ زنانہ سا ٹریک ہے..''

''کل علتر جھیلوں کے راستے میں جو نالہ آن پڑا تھا اور پھر یہ جو سیاہ ندیاں عبور کی ہیں اور ابھی ابھی جو یاکوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے کا پروگرام ہونے لگا تھا اس کے بارے میں آپ کی پُشت کیا کہتی ہے''

''کچھ نہیں کہتی جناب عالی..بس تسلی نہیں ہوتی..نہ کسی برالڈو کے اوپر معلق کوئی بی پی گیلری ہے..نہ کسی بیافو گلیشیئر سے ایک کلومیٹر کی بلندی پر کوئی چٹان اور شکاری جھونپڑا ہے..اور نہ کوئی برفانی پُل صراط ہے اور نہ کوئی درگوتھ کی ندیاں..موت کے ساتھ دست پنجہ نہ ہو تو تسلی نہیں ہوتی مزا نہیں آتا..''

شاہد اب تک بحال ہو چکا تھا اس نے دھیمے لہجے میں کہا'' نہ آپ اپنے بھائی دروازے کے کسی اکھاڑے میں اُترے ہوئے ہیں..موت سے دست پنجہ لے کر اسے دھوبی پٹڑہ دینا چاہتے ہیں..تب آپ کی تسلی ہوگی''

''دراصل راستے میں کوئی ناپے پتھر بھی تو نہیں آئے جن پر میں اپنے آپ کو بیلنس کرتا اور تاتھئی تاتھئی کرتا..'' میاں جی ذرا کھسیانے ہو گئے'' راستہ بے شک مشکل تھا لیکن جان لیوا نہ تھا اور جب تک کسی ٹریک کے دوران فوتیدگی کے امکان پیش نہ آئیں روح میں بالیدگی پیدا نہیں ہوتی..''

''پرسوں ہم درہ علتر کو عبور کریں گے تو آپ وہاں اپنی روح میں بالیدگی پیدا کر لیجیے گا''

''خطرناک ہے؟''

''خطرناک ہے؟''

''تو پھر سبحان اللہ..'' میاں صاحب کی مسرت دیدنی تھی'' تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے''

کہا تو یہ جاتا ہے کہ ہمہ یاراں دوزخ..اور ہمہ یاراں جنت..لیکن لوئر شاہی کی خیمہ گاہ

میں کہا جا سکتا تھا کہ ہمہ یاراں ایسی بلندی.. ایسی برفیں اور ایسی چراگاہ.. سبحان اللہ.. '' ویسے میاں صاحب یہ تو آپ نے درست فرمایا کہ ٹریک کے ان دو دنوں کے دوران فوری طور پر فوحیدگی کے امکان کچھ کم تھے لیکن جب دو یاکوں کا ریوڑ یکدم ڈھلوان پر سے لڑھکتا ہماری جانب آیا تھا تو تب آپ کے کیا احساسات تھے؟''

'' سچی بات ہے پہلے تو سب کچھ حوش ہو گیا تھا بی پی ہو گیا تھا.. لیکن پھر میں نے ان یاکوں میں سے یاکنیاں تلاش کرنی شروع کر دیں.. '' میاں صاحب کو یاک سرائے کی کوئی من موہنی یاکنی یاد آ رہی تھی..

'' کیوں حسن صاحب؟''

'' سر کیا بات ہے..''

'' کونسی بات کیا بات ہے'' شاہد کے منہ سے نکل گیا..

'' کوئی نہ کوئی بات تو ہے جو کیا بات ہے''

'' لعنت ہے مجھ پر..'' شاہد منہ پھلا کر بیٹھ گیا..

'' لیکن سر عشق کیا ہے..'' سلیم کی سوئی عشق پر اٹکی ہوئی تھی..

'' تم چپ ہوتے ہو کہ نہیں'' میں نے اُسے ڈانٹا '' کیا ایک بینڈے کی طرح عشق عشق لڑاتے رہتے ہو''

'' اس لیے کہ میں بھی عشق میں ایک بینڈا ہو گیا ہوں''

'' یہ بینڈا کیا ہوتا ہے سر جی؟'' حسن نے معصومیت سے پوچھا..

'' ایک جھل.. ایک جھنگر جو سدا اترا اترا رہتا ہے..''

'' کیا بات ہے سر جی..''

'' کونسی بات کیا'' میں نے فوراً اپنے آپ کو روک لیا لیکن حسن نہ رک سکا اور مزید معصومیت سے کہنے لگا '' کوئی سی بھی بات کیا بات ہے سر جی..''

لوئر شاہجی کی برف پوش اونچائیوں پر ایک خیمے میں یہ کیا یادگار محفل تھی..

'' کھانا تیار ہے صاحب..'' ابراہیم کا بلاوا آ گیا..

ہم سب ہمہ یاراں جھکے جھکے خیمے سے باہر آ گئے..

اور خیمے سے باہر لوئر شاہجی کی سرد رات کب سے ہماری منتظر تھی.. اس نے ہمیں اپنی

ٹھنڈک سے نیلی ہوتی بانہوں میں لے لیا..

گلیشیئر کے بلند کناروں پر براجمان ایک الاؤ کے گرد گھیرا ڈالے ہمارے پورٹر وہ پورٹر ہرگز نہ تھے جو ہم سے ناراض ناراض.. روٹھے ہوئے.. لاتعلق.. بوجھ اٹھائے ہم سے بے خبر آگے آگے چلے جاتے تھے بلکہ وہ سب کے سب ماہر رقاص اور گلوکار ہو چکے تھے.. اور اپنے اپنے محبوب سے جدائی میں آہیں بھرتے.. اُس کے حسن کی توصیف کرتے.. گلے پھاڑ کر گیت گاتے تھے..

کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑے پتھر کے اوپر طاہر کھڑا تھا اور ایک طویل قامت جن کی مانند کھڑا تھا اور مسلسل گلیشیئر کو گھور رہا تھا اور کاظمی قہقہے لگاتا اسے بار بار تنبیہ کر رہا تھا.. او بے طاہر گلیشیئر کو کچھ نہ کہنا یار...

گدا اور گرد آمیز البتہ ابھی تک اپنے خیمے کی پرائیویسی میں پوشیدہ تھے..

انسان ایک عجیب نا قابلِ فہم جانور ہے..

آپ اس کے ہمراہ ایک عمر بتا دیتے ہیں.. طویل رفاقتوں کے دوران آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اسے جان گئے ہیں اور آپ کچھ بھی نہیں جانتے.. وہ کسی ایک لمحے گرگٹ کی طرح بنا معذرت کے ساتھ اپنا رنگ بدل لیتا ہے وہ اپنے مفادات کا حساب لگاتا ہے اور فوراً رنگ بدل کر آپ کو آپ کے ساتھیوں کو ترک کر دیتا ہے اس کے باوجود کہ آپ اس کی گمنامی کو شہرت میں بدل چکے ہیں.. اس کی بے جا توصیف کرتے ہیں لیکن وہ اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوتا ہے..

انسان واقعی ایک نا قابلِ فہم جانور ہے.. بلکہ جانور تو قابلِ فہم ہوتا ہے..

گدا ہمیں گرد آمیز کی خوشنودی کی خاطر ترک کر چکا تھا..

عمران ایک گنجے مکڑے کی مانند کیمرے میں سر گھسائے پورٹروں کا رقص فیتے پر اتار رہا تھا اور طاہر ابھی تک لوئر شاہجی گلیشیئر کو گھور رہا تھا اور کاظمی اب قہقہے لگانے کی بجائے نہایت سنجیدگی سے اُسے درخواست کر رہا تھا کہ یار طاہر.. گلیشیئر کو کچھ نہ کہنا.. اس کا کوئی قصور نہیں..

آج لنچ کے بعد جس بلند میدان پر ہم آئے تھے اور پھر سیاہ ندیوں تک اُترے تھے وہ نیلو لاٹ کہلاتا تھا.. ہمیں سے وہ برف میں سفید ہوتی گنبد نما وہ چوٹی دکھائی دی تھی جسے ڈوم کا نام دیا گیا تھا اور اس کی بلندی 5029 میٹر تھی.. یہ یہاں سے لوئر شاہجی کی خیمہ گاہ سے بھی ایک برف گنبد کی صورت آسمانوں میں اذانیں دیتی تھی..

اور جب ہم اپنے خیمے سے باہر آتے ہیں تو شاہجی گلیشیئر کے پار نہ صرف 5.260 میٹر

اونچی سینٹینل پیک یعنی محافظ چوٹی دکھائی دے رہی تھی بلکہ ہمارے سامنے 5887 میٹر بلند شاہی چوٹی بھی اپنے سفید جوبن کے اُبھاروں کے ساتھ کھڑی تھی.. میرے جوبناں کا دیکھو اُبھار جہاں.. بقول جوش.. اور اُبھار جو جوبن کے ہوتے ہیں عام اور قدرتی حالات میں دو ہوتے ہیں یہاں تین تھے..... تین سروں والی شاہی چوٹی.. تین گنبدوں کے اُبھاروالی شاہی آسمانوں کے سامنے سینہ نہیں سینے تانے کھڑی تھی اور اس کے سفید برفیلے جوبن کا جواب نہ تھا.. اس کے برابر میں دو جڑواں چوٹیاں تھیں جنہیں جڑواں یعنی ٹوِنز ہی کہا جاتا تھا.. ان کی بلندی میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ جڑواں بچوں کی پیدائش میں ہوتا ہے.. یعنی ایک جو پہلے پیدا ہوئی تھی 5798 میٹر اونچی تھی اور دوسری 5700 میٹر کی تھی.. یہ سات سو میٹر کا فرق اُن کی پیدائش میں وقفے کا تھا..

یہ لوئر شاہی کا شاہانہ منظر تھا..

ویسے اس لوئر شاہی کی ساری شہنشاہیت اور جاذبیت اور بلند برفانی تنہائی کی جاذبیت دراصل ہم سے تھی..

ہم اپنے اپنے شہروں میں.. اپنے روزمرہ کے کاموں میں الجھے ہوئے وہاں بھی اسی تنہائی اور جاذبیت کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتے دبائے ہوئے زندگی کرتے ہیں اور اس کیفیت کو ایک عشق خاص کی مانند دنیا بھر سے چھپائے ہوئے رہتے ہیں..

اور یہ کیفیت یہاں لوئر شاہی میں اس پوشیدگی سے باہر آ گئی تھی..

یہ ہم ہی تھے جو اس بلند چراگاہی خیمہ گاہ کو حسن دیتے تھے ورنہ دیکھا جائے تو لوئر شاہی کیا تھی..

چند پتھر.. تھوڑی سی گھاس اور ایک ویران بلندی..

شاہی پیک کے تین سفید گنبد جن کے ابھاروں میں جو نا آسودگی تھی اُسے ہم نے اپنی آنکھوں سے آسودہ کیا..

تو یہ صرف ہم تھے جو آج کی شب اس چراگاہی خیمہ گاہ کو زندگی.. رونق اور خوبصورتی عطا کرتے تھے..

ہم نے کل سویرے یہاں سے کوچ کر جانا تھا اور ہمارے بعد اس نے پھر سے بے آباد اور ویران ہو جانا تھا..

تو یہ صرف ہم تھے..

''شاہی پیک کی تین چوٹیوں سے اُترتی برف کا آبشار.. ایک ایولانچ''

تین سروں والی شاہی پیک ایک ترشول کی مانند شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان میں خاموش کھڑی تھی.. ایک چُپ سکوت میں تھی.. اور ہمیں علم گلیشیر کے پار ایک رنگ و بو سے اٹی.. گل وگلزار ہوتی ڈھلوان میں چلتے دیکھتی تھی جب اس کی دو چوٹیوں کے درمیان جو برفوں کا بوجھ تھا اور جانے کب سے تھا اپنے آپ کو مزید سہار نہ سکا اور شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان کے گنبد میں ایک ملفوف گونج کے ساتھ وہ برفوں کا بوجھ ایک سفید آبشار کی مانند نیچے گرنے لگا..

اس کی گڑگڑاہٹ اور مسلسل گونج سے پوری وادی لرزنے لگی..

ہم سب.. چلتے چلتے.. جہاں کہیں بھی تھے رک گئے اور اپنے اپنے مقام پر.. دم بخود اس برفانی آبشار کی دودھ سفیدی اور باریک پھوار کو نیچے گرتے دیکھنے لگے.. برف کا انبار دونوں چوٹیوں کے درمیان میں سے بہتا ایک خاص مقام پر پہنچ کر ایک آبشار کی صورت گرتا چلا جاتا تھا اور پھر ایک برف زار پر گر کر اس کی برفوں کو بھی اپنے آپ میں شامل کر کے ایک سفید غبار اٹھاتا نیچے گلیشیر تک اترتا جاتا تھا.. یہ آبشار مسلسل تھی اور تھمنے میں نہ آتی تھی.. لگتا تھا کہ شاہی پیک کی تینوں چوٹیوں پر ازل سے جو برفیں سکوت میں تھیں وہ سب کی سب اسی لمحے کی منتظر تھیں اور اب اس سفید آبشار نے تب تک گرتے جانا تھا جب تک کہ یہ تینوں چوٹیاں ننگی نہیں ہو جاتیں.. وہ برہنہ اور چٹیل ایسے ہو جائیں گی جیسے کبھی برف سے وہ آشنا نہ ہوئی تھیں..

برفیں ایک مسلسل سفید دھند کی صورت گرتی جاری تھیں اور ہم دم روکے انہیں دیکھتے

جا رہے تھے.. آج کا دن...... یہ ایک ایسا کھلکھلاتا شفاف دن تھا جس کی آرزو ہر کوہ نورد کرتا ہے.. راستہ ایسا رنگ رنگ کے پھولوں سے آراستہ.. جس پر چلنے کی خواہش ہر آوارہ گرد کے دل میں کسک بھرتی ہے..

جس بلند ڈھلوان پر ہم چل رہے تھے وہ لوزر شاہی کی خیمہ گاہ کے تسلسل میں تھی اور یہاں بھی گلیشیر اور اس ڈھلوان کے درمیان میں ایک تنگ وادی تھی جس کے اونچے کناروں کے دوسری جانب گلیشیر کا پھیلاؤ پھنکارتا تھا اور اس کے پار وہی دیدہ زیب برف بھری بلند چوٹیاں تھیں جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں.. آسمانی درجوں پر فائز شاہی پیک پر سے ایک ایولانچ اتر رہا تھا.. ایک برف پھوار آبشار گر رہی تھی..

یہ ایک ایسا ہی دن تھا..

اور تب ہم جان گئے تھے کہ یہ ہمارے ٹریک کا سب سے دل فریب راستہ اور بدن سے آلام اور دکھوں کی سیاہ کائی اتار دینے والا دن ہے.. آج صبح لوزر شاہی کی ڈھلوانوں پر ہم نے دیکھا کہ یاکوں کے ریوڑ اوپر بلند چراگاہوں کی جانب اپنا سفر شروع کر چکے تھے.. وہ سفید اور سیاہ دھبوں کی صورت جھاڑیوں اور گھاس میں ہولے ہولے اوپر اٹھتے جاتے تھے.. ان کے سموں سے ہلکی دھول اٹھتی تھی جو چوٹیوں سے اترتی صبح کی دھند سے ملاپ کرنے کو اوپر اٹھتی تھی..

انہی یاکوں نے سرِ شام ان ڈھلوانوں پر سے لوٹنا تھا لیکن اپنے راستے میں ان کوہ نوردوں کو نہیں پانا تھا جو خیمے سمیٹ کر کوچ کرنے کو تھے..

لوزر شاہی کی یہ چراگاہ جس میں ہم نے خیمے نصب کیے تھے کچھ کچھ ویسپر گلیشیر کے کناروں پر جو مختصر ہرے بھرے پیالہ نما جزیرے تھے اُن سے مشابہ تھی.. شائد یہ اُن جیسا ہی حسن بے مثال رکھتی ہو لیکن ماضی کی بڑی مصیبت ہوتی ہے.. یہ آنکھوں کے سامنے کی حقیقت نہیں دیکھ سکتا.. گزرے زمانوں کے خوابوں میں مبتلا رہتا ہے.. اس کی سیاہ غار میں جو کچھ چلا جائے وہ فقید المثال لگتا ہے کہ بیت چکے منظروں اور چہروں میں جدائی کے برسوں کے رنج اور انہیں پھر سے دیکھنے کی کسک شامل ہوتی ہے.. لوزر شاہی عین ممکن ہے کہ سنو لیک کی خیمہ گاہوں سے کمتر نہ ہو لیکن یہ ایک برف تنہائی کے سکوت میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی جگہ نہ تھی جہاں صرف اور صرف آپ کے سانس چلتے ہیں اور آپ کے قدموں کی چاپ ہے اور کچھ نہیں.. کئی دنوں کی مسافت پر کچھ نہیں اور اشکولے بہت پیچھے رہ گیا ہے اور ہنزہ بہت آگے کہیں ہے.. اور آپ کہاں

ہیں؟ کہیں بھی نہیں.. اوپر آسمان اور نیچے برف اور آپ چلتے چلتے جانور ہو جاتے ہیں بھیڑیے اور مارخور ہو جاتے ہیں.. یہ ایسی تنہائی نہ تھی..

ڈھلوان بے نشان نہ تھی.. اُس پر یاکوں نے راستے بنا رکھے تھے اور ہم ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلتے تھے.. قافلہ ہائے رنگ و بو میں سے گزرتے چلتے تھے.. نیچے گہرائی میں گلیشیر کے کنارے کی اوٹ میں گوجروں کا ایک جھونپڑا تھا جس میں سے ایک سُرخ دھبہ گوجر گرل سرخ ملبوس میں نکلی اور بلند کنارے پر چڑھنے لگی.. ہم تو اسے دیکھ رہے تھے لیکن اُس کے لیے ہمیں دیکھنا ممکن نہ تھا کیونکہ ہم گھاس اور پھولوں میں اوجھل ایک پگڈنڈی میں اوجھل تھے..

اور یہی وہ مقام تھا جب ہم ٹریک کی تمام تر دشواریاں بُھلاتے.. پورٹروں کے دنگا فساد کو فراموش کرتے.. نہ جھیلوں کے راستے میں پڑتے نالے کو یاد کرتے اور نہ ہمیں روند دینے والے یاکوں سے شکایت کرتے یہاں تک کہ گدا اور گرد آمیز کے ناروا سلوک کو بھی فراموش کرتے کل دنیا کے لیے امن و آشتی اور محبت کے جذبات رکھتے چل رہے تھے جب ہماری نظروں کے سامنے شاہی پیک میں سے ایک گہری گونج کے ساتھ جنم لیتے ایولانچ نے ہمارے قدم روک لیے.. اور ہم جہاں کہاں تھے رک گئے.. دم بخود اسے تکنے لگے..

گرد آمیز اپنے متعدد تھیلوں کی پھولا پھالی کر رہا تھا جن میں اُس کے آلات کیمرہ بازی بند تھے.. اور وہ ایک لمبے بگل نما قدرے فحش لگتے ٹیلی لینز کو اپنے کیمرے کے منہ میں گھسیڑ کر اس ایولانچ کی تصویریں اُتارنے کو تھا..

عمران ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں دم روکے کیمرہ آن کئے بیٹھا تھا اور اس کے بغل بچے بھی سانس نہیں لے رہے تھے..

یہ ہمارا پہلا ایولانچ نہیں تھا..

لیکن برف کے یکدم گرنے اور گونج مچانے کا ہر منظر اپنے اندر وہ سحر رکھتا ہے کہ پہلا ہی لگتا ہے..

ہم نے یہ ایولانچ کہاں کہاں نہیں دیکھے تھے..

اور جب بھی دیکھے تھے اُن کی گونج.. سفید گرد اور ان کی پرشکوہ سفید آبشاری کیفیت نے ہمیں گرفت میں لے کر دم بخود کر دیا تھا.. جیسے ہم انہیں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں.. بیال کیمپ اور اس کے دوسری جانب وادی رُوپل کے پار تاپ میدان میں گرتے نانگا پربت کے برفانی

تودے.. کنکورڈیا کے گرد پہاڑوں کے جو آسمانی تخت تھے.. چوغولیزا.. مشابرم.. براڈپیک اور کے ٹو ان کی برفوں کے پیچھے آنے کے منظر.. اور سنولیک کے سفر کے دوران تو وہ بیک گراؤنڈ میوزک کا کام دیتے تھے.. کچھ لمحوں کا سکوت بھی الجھن میں مبتلا کرتا تھا کہ کوئی ایوالانچ گرے تو زندگی نارمل ہو..

شاہی پیک سے گرنے والی دُھند آبشار کے حجم میں کمی آنے لگی..

آہستہ آہستہ اس کے گرنے کی گونج معدوم ہونے لگی.. اور اب صرف سفید سلوف کے بادل رہ گئے جو باریک ہوتے.. اپنے عقب میں پوشیدہ چٹانوں کو ہولے ہولے ظاہر کرتے چھٹ گئے.. پہاڑوں کا منظر اپنے ابتدائی سکوت میں چلا گیا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو.. شاہی چوٹی.. بلکہ اس کی تینوں چوٹیوں پر اب بھی اتنی ہی برف تھی.. لگتا تھا کہ ان میں سے ایک ذرہ بھی کم نہیں ہوا..

"کوہ قاف کے میدان میں چرتے کھلونا گھوڑے.. گھاس کے بلند تخت"

ہم پھر سے چلنے لگے..

میں کل گھوڑا ہو گیا تھا.. جب کہ مجھے خچر ہونا چاہیے تھا..

اور آج جب کہ مجھے اصول کے مطابق گھوڑا ہونا تھا میں خچر ہو گیا تھا..

البتہ میرے ساتھی نہ صرف گھوڑے بلکہ عربی گھوڑے ہو گئے تھے اور مجھ سے کہیں آگے نکل گئے تھے.. صرف سلیم تھا جو اپنے آپ پر جبر کر کے میرا ساتھ دے رہا تھا.. گرد آمیز ایک پلاسٹک کی پھیلی پھولی ہوئی جیکٹ میں یوں ملفوف تھا جیسے زرد ریپر میں ایک میٹھی گولی پیک کی گئی ہو.. اس نے بالوں کی تقریباً مکمل رخصتی کو ایک نیلی پی کیپ میں پوشیدہ کر رکھا تھا اور اس کیپ کے پیچھے پر "نامی" کا لفظ سرخ دھاگے سے کاڑھا ہوا تھا..

عمران جب بھی اپنے کیمرے کا رخ اس کی جانب کرتا تو اُسے متوجہ کرنے کے لیے "نامی نامی" کہتا اور گرد آمیز پیچھے مڑتا تو وہ کہتا.. ہیلو ڈیئر نامی.. گڈ بوائے.. شیک ہینڈز..

شاہی گلیشیئر ذرا پرے ہونے لگا.. یا ہم اُس سے پرے ہونے لگے اور دھیرے دھیرے آسمان کے قریب ہونے لگے..

ایک موڑ پر.. عین سامنے بلند و بالا پہاڑوں میں گھری ایک مختصر وادی دکھائی دینے لگی.. جیسے ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہو.. اس وادی سے اوپر برفانی بلندیوں کی اوٹ میں ایک آسمانی تخت کی مانند بلند ایک وسیع اور ہرا بھرا چکور میدان دکھائی دینے لگا.. یہ میدان وادی اور برفانی پہاڑوں کے درمیان میں معلق نظر آتا تھا.. ان دونوں سے الگ تھلگ اور تنہا..

ہم پھر رُک گئے..

یہ یقین سے ماورا ایک ایسا میدان تھا جو کوہ قاف میں بچھا تھا.. وادی سے اوپر برفوں کے سائے میں یہ ہرا ابھرا تخت کسی ناآسودہ جن نے اپنی محبوبہ کے وصل کے لیے بچھا رکھا تھا..

یہ میدان خالی نہ تھا..

اس میں گھوڑوں کے ننھے ماڈل تھے.. یاکوں کے چند کھلونے تھے جب کبھی کوئی گھوڑا گھاس سے سر اٹھاتا تو پھر شک ہوتا کہ نہیں یہ کھلونا تو نہیں اس میں جان ہے اور یہ سچ مچ کا گھوڑا ہے جو دوری کے باعث کھلونا لگ رہا ہے.. اس دوری نے انہیں کسی مغل منی ایچر میں شکار کے منظر کے مختصر گھوڑے بنا دیا تھا.. اوپر برفیں تھیں اور اُن کے دامن میں یہ ہریاول نظر میدان نظر کا دھوکا تھا اور اس کی ہرا سمندر گھاس میں بہت دور.. کچھ گھوڑے تھے.. چند یاک تھے..

ظلتر پکھورا ٹریک اتنا بھی معمولی اور بے رُوح نہیں تھا جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا.. اگر اس راستے میں صرف اسی میدان کا دھوکے باز منظر ہوتا تو بھی ادھر سے گزرنا جائز ٹھہرتا..

گلگت میں اکرام بیگ کی ایک تصویری البم میں اسی میدان کی ایک تصویر میں نے دیکھی تھی.. خیموں سے آراستہ اس میدان کے پس منظر میں برف کی دیواریں تھیں اور اس نے بتایا تھا کہ آپ ایک رات یہاں بسر کریں گے.. میں اس تصویر کو بھول چکا تھا اور اب وہ یکلخت میرے سامنے آ گئی تھی..

ازابیل نشاء جس نے پاکستانیوں کو پاکستان کے راستے دکھائے ہیں لکھتی ہے..

"آپ شاہی گلیشیر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے تین گھنٹوں میں اپرشاہی میں پہنچتے ہیں .. ڈھلوان چراگاہوں کا ایک وسیع میدان جس میں گڈریوں کے چند بے آباد جھونپڑے ہیں.. وہاں تک پہنچنے کے لیے آپ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہیں.. ایک ندی کو عبور کرتے ہیں اور وہاں سے سیدھا ایک عمودی بلندی پر ایک بل کھاتے راستے پر چڑھنے لگتے ہیں جہاں پھول تمہارے گھٹنوں تک آتے ہیں اور بالآخر ایک ایسے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں یاکوں کے ریوڑ اور گھوڑے چرتے ہیں.. آپ کہیں بھی کیمپ کر سکتے ہیں.. وہاں شفاف ندیاں ہیں اور برف کے منجمد ستون آپ کے عین اوپر معلق ہوتے ہیں.. یہ میدان تقریباً تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے..

"ابراہیم.."

وہ بہت آگے جا چکا تھا.. لیکن میرے پکارنے پر واپس ہوا اور لڑھکتا سنبھلتا مجھ تک پہنچ

گیا اور بریک لگا کر بولا "جی صاحب.."

"وہ برفوں کے نیچے جو میدان دکھائی دے رہا ہے.. جہاں یاک اور گھوڑے چرتے ہیں.."

"جی صاحب.. اپرشاہی ہے"

"رات اُدھر کریں گے ناں؟"

"نہیں صاحب.. آگے جائیں گے"

"آگے کہاں؟"

"درہ ظلتر کے نیچے جو اس کا بیس کیمپ ہے وہاں تک پہنچیں گے جناب اور وہاں رات کریں گے.."

"لیکن ٹریکنگ کی تمام کتابوں میں یہی درج ہے کہ رات اپرشاہی کے اس میدان میں کی جاتی ہے تو ہم کیوں نہیں کرتے.."

"صاحب ایسا ہی ہوتا ہے.. اور ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. آپ لوگ گورا لوگ کے موافق نہیں چلتا.. بہت سوچ سوچ کر چلتا ہے.. تصویریں اتارتا ہے.. فلم بناتا ہے.. تو اگر ہم اپرشاہی میں رات کرتا ہے تو کل سویرے ہمیں ظلتر ٹاپ کے بیس کیمپ تک پہنچتے کم از کم تین گھنٹے لگے گا.. وہاں سے ٹاپ کو پار کر کے جب ہم سرخ پتھر کیمپ تک پہنچے گا تو آپ کی رفتار سے آدھی رات ہو جائے گا.. اور اُدھر راستہ اچھا نہیں ہے.. بہت تیکھا اور اونچا ہے رات کے ٹیم گلیشیر میں گر جائے گا.."

"نہیں ابراہیم.. ہم کل بہت تیز تیز چلے گا.. کوئی ریسٹ نہیں کرے گا لیکن رات اُسی میدان میں کرے گا جس میں یاک اور گھوڑا چرتا ہے.."

"ٹھیک ہے صاحب.. ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. یہ تو قریب ہے.. ہم بیچ اُدھر جا کرے گا.. لیکن پھر ٹریک میں ایک اور دن لگے گا.. رات کو نہیں چلے گا اور ایک اور دن کا مزدوری بھی بڑھ جائے گا کیا کہتا ہے کہ پھر چلے؟"

مجھے تو مزدوری بھی منظور تھی..

لیکن کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. میں نے جیپ ڈرائیوروں کو پورے پانچ روز بعد وادیٔ اشکومن کے گاؤں پکھورا میں پہنچ جانے کے لیے کہہ رکھا تھا.. انہوں نے وہاں پہنچنا تھا اور ہمیں وہاں موجود نہ پا کر واپس گلگت چلے جانا تھا.. ہم اگر ایک روز کی تاخیر سے پہنچتے تھے تو اگلے روز کسی اور سواری کا بندوبست بھی ہو سکتا تھا.. لیکن ہم نے

ڈرائیوروں کو کچھ رقم پیشگی بھی ادا کر دی تھی.. اور شائد ہمیں اگلے روز کوئی سواری نہ ملتی..

کیا یہ میدان نظر کے سامنے.. دور سے دکھتا.. کوہ قاف کے دامن میں.. وادی پر معلق ایک ہرا ابھرا بے یقین کر دینے والا میدان جس پر برفوں کے منجمد ستون جھکے ہوئے تھے ایسے کہ وہ اُس پر گر بھی سکتے تھے اور اس میں گھوڑوں اور یاکوں کے کھلونے گھاس میں تھوتھنیاں دیئے مختصر مجسمے تھے.. اور اس کی ہوائیں بھی الگ ہوں گی اور ان میں سانس لیتے ہوئے برف کی کرچیاں بھی بدن میں اترتی ہوں گی.. برفیلی سرد یلی بدن کو کاٹتی اور پھر گھاس پر پھیلتی اُس کی ایک ایک پتی کو سرد کرتی کنواری.. چھنکتی سرد ہوائیں..

کیا یہاں سے.. اس ڈھلوان سے نیچے اترنا.. وہ جو برفانی ندی نیچے وادی میں بہہ رہی ہے اسے عبور کرنا.. پھر سے اوپر چڑھنا.. بلند ہوتے جانا اور وہاں تک پہنچ جانا جہاں یہ سرسبز تخت بچھا ہے اور وہاں برف ستونوں کے دامن میں خیمہ لگا کر اس منظر کا ایک حصہ بن جانا.. کیا یہ اس لائق تھا کہ پھورا میں ہماری منتظر جیپیں ہمیں وصول کیے بنا واپس ہو جائیں اور ہم وہاں جانے کب تک کسی سواری کی آس میں پڑے رہیں اور ہماری پیشگی رقم بھی ضائع ہو جائے..

یقیناً یہ سب کچھ اس لائق تھا..

لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. کہیں بلند پہاڑوں میں اگرچہ عمومی تاثر تو یہی ہے کہ آپ آزاد اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا وہاں نیچے کی دنیا کی نسبت کہیں زیادہ پریکٹیکل ہونا پڑتا ہے.. دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے.. حساب کتاب مسلسل کرنا پڑتا ہے کہ اتنے دنوں کا راشن ہے.. اتنی ہمت ہے.. پورٹروں کے ساتھ کیا طے ہوا ہے.. ایک لہر میں.. ایک موج میں.. من کی موج میں.. ایک ترنگ میں اپنے طے شدہ منصوبے سے یکدم انحراف نہیں کر سکتے.. کوہ نوردی کے مذہب میں بھی کچھ بنیادی رکن ہوتے ہیں جن سے انحراف پر آپ مرتد ہو جاتے ہیں.. بھٹک جاتے ہیں..

''ابراہیم کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر ہم اُس میدان میں رات کرتے ہیں تو کل اپنی اگلی خیمہ گاہ سُرخ پتھر تک.. شام تک نہیں پہنچ سکتے.. ٹریک میں ایک اور دن کا اضافہ ہو جائے گا؟''

''ہاں صاحب..''

''تو پھر چلے چلو ابراہیم.. گھاس کے ایک بلند تخت.. کچھ برفوں.. چند یاکوں اور گھوڑوں کے لیے ایسا کرنا حماقت ہوگا..''

''ٹھیک ہے صاحب..'' وہ لڑھکتا ہوا پھر آگے چلا گیا..

میں نے اگرچہ کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن میں چلتے چلتے ٹھوکریں کھاتا تھا کہ میں اپنا راستہ نہیں دیکھتا تھا اس معلق ہرے بھرے تخت کو دیکھتا تھا جس پر براجمان ہونا میرے نصیب میں نہ تھا..

ازابیل نشاء نے بھی لکھا تھا کہ اگر آپ اس میدان کی جانب نہیں جاتے اور درہ ملتر کا رخ کر لیتے ہیں تو یہ ایک ایسا راستہ ہے جو خوش نظر نہیں اور اس پر صرف گدھے چلتے ہیں..

چنانچہ ہم بھی چلنے لگے.. اور ہم کیسے شاندار گدھے تھے جو کوہ قاف کی بجائے کسی اور جانب تھوتھنیاں اٹھائے چلنے لگے تھے..

ہم ڈھلوان سے اُترتے گئے اور وہ میدان ہم سے اونچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کی گھنی ہریاول اور اس میں چرتے یاک اور گھوڑے روپوش ہو گئے اور صرف اس کی چٹانی ڈھلوانیں سامنے رہ گئیں جن کے دامن میں وہ ندی بہتی تھی.. اور اس ندی کو ہمارے دو پورٹر عبور کرنے کی کوشش میں تھے کہ وہ اپنے تئیں اپر شاہی کو جاتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ہم اس کی خواہش کو ترک کر چکے ہیں.. ابراہیم نے سیٹیاں بجا کر انہیں متوجہ کیا اور اشارے سے بتایا کہ اُدھر نہیں جانا.. درّہ ملتر کے بیس کیمپ کی چڑھائی کی طرف آ جانا ہے..

ابھی میں اُس میدان سے جدائی کے سوگ میں تھا.. کہ سلیم جو بہت دیر سے چُپ چلا آتا تھا میرے کندھے سے جھانکتا ہوا بولا ''سر آپ اپنی بُڈھی سے مطمئن ہیں؟''

''بُڈھی؟''

''بُڈھی.. آپ کی بیگم.. ہماری بھرجائی..''

اہلِ لاہور کے اس کُھردرے اور بدتمیز اظہار سے میں کبھی مفاہمت نہیں کر پایا کہ وہ اپنی بیگم کو بُڈھی کہتے ہیں..

کیا ایک ایسی خاتون کو جو بے شک مین ایجر ہو لیکن آپ کی بیوی ہو اُسے بُڈھی کہہ کر اس کے بستر میں شریک ہو سکتے ہیں..

''یار ابھی تو یہ عشق کیا ہے والا مسئلہ طے نہیں ہوا اور اب یہ.. بڈھی کا سوال آ گیا ہے''

''یہ دونوں سوال آپس میں جُڑے ہوئے ہیں سر.. اگر آپ اپنی بڈھی سے مطمئن ہیں تو پھر عشق کیسے کریں گے.. نہیں سمجھے؟''

''سمجھ تو گیا ہوں لیکن یہ سوال ہرگز جڑے ہوئے نہیں ہیں.. ایک اپنی بڈھی سے مطمئن

شخص بھی دماغ کے اس خلل میں مبتلا ہو سکتا ہے.. تم بتاؤ؟''

''میں بھی مطمئن ہوں..''

''تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟''

''یونہی''

''پھر بھی..''

''میری بڑھی ڈاکٹر ہے.. بڑی قابل قسم کی.. اور دیگر ڈاکٹروں کی مانند بے حد پریکٹیکل ہے اور اس میں حس مزاح بالکل نہیں ہے اور میں ٹھہرا پکا لاہوریا تو مجھ میں کچھ مزاق کرنے کی پیدائشی عادت ہے.. تو ابھی ہماری شادی کو چند روز گزرے تھے میں اپنی پرانی کار میں اسے بٹھا کر سیر کے لیے لے گیا.. ایک ٹریفک لائٹ سرخ ہوئی تو میں رُک گیا.. برابر میں ایک اور کار آ کھڑی ہوئی جس میں ایک نو بیاہتا جوڑا تھا.. میری بڑھی کہنے لگی'' ذرا دیکھو ان کی کار تو نئے نویلے ماڈل کی ہے..'' میں نے کہہ دیا کہ اس کی بڑھی بھی تو دیکھو کتنی خوبصورت ہے..''

''نہایت واہیات بات کی تم نے.. پھر کیا ہوا؟'' سانس اگرچہ پُھولتا تھا لیکن میں اپنی ہنسی روک نہ سکا..

''بس وہ ناراض ہو گئی.. منہ پُھلا کر روٹھ گئی.. بڑی مشکل سے منایا کہ جان میں تو مذاق کر رہا تھا.. ایک مرتبہ وارڈ ڈیوٹی کرنے کے بعد گھر واپس آئی تو بے حد خوش تھی.. چہکتی ہوئی تھی.. کہنے لگی.. تمہیں پتہ ہے آج جب میں وارڈ میں داخل ہوئی تو تمام مریض میری جانب متوجہ ہو گئے اور ان میں سے ایک کہنے لگا.. '' ڈاکٹر صاحبہ آپ کتنی خوبصورت ہیں'' .. سلیم رُک گیا.. میری خاطر کہ میں سانس درست کرنا چاہ رہا تھا..

''تو پھر..''

''تو پھر سر.. میری تو کُتی زبان ہے میں نے ہنس کر کہا.. اچھا اچھا آج پاگلوں کے وارڈ میں تمہاری ڈیوٹی تھی..''

''مجھے شرم آ رہی ہے کہ تم جیسے لوگ میرے دوست ہیں..''

''مجھے بھی شرم تو بہت آئی لیکن زبان پر اختیار نہیں تھا.. میری بڑھی پھر ناراض ہو گئی.. لیکن آہستہ آہستہ اُسے عادت ہو گئی.. بُرا تو اب بھی مان جاتی ہے لیکن بائیکاٹ نہیں کرتی.. آپ جانتے ہیں کہ اس عمر میں بڑھی بائیکاٹ کر دے تو.. بُرا حال ہوتا ہے.. آپ کی عمر میں کر دے

تو آپ رب کا شکر ادا کرتے ہیں''

''صحیح.. میری عمر میں بڑھی بائیکاٹ کر دے تو عزت رہ جاتی ہے.. مطمئن اور نا مطمئن کی کیفیت تو پچھلے زمانوں کی بات ہے.. اب تو پانی سر سے گزر چکا.. ویسے ہم بے دھیانی میں چل رہے ہیں.. تم ذرا دھیان سے اس ندی کو عبور کرو..'' ہم ڈھلوان کے دامن میں پہنچ چکے تھے جہاں ایک واجبی سی ندی ہمارے راستے میں آ گئی تھی.. اسے شاہد اور میاں صاحب کب کے پار کر چکے تھے اور حسن صاحب اس کے پار جانے کے لیے پر تول رہے تھے..

اور اس لمحے جب ہم نے حسن صاحب کو اس ندی کو پرکھتے اور پَر تولتے دیکھا تو اس سے اگلے لمحے انہوں نے پانیوں میں ابھرے ہوئے ایک پتھر پر پاؤں جمائے.. پھر دوسرا قدم رکھا اور پھر جانے کیا ہوا.. وہ جو پَر تولتے تھے ان میں توازن نہ رہا اور وہ منہ کے بل ندی میں گر گئے..

یہ زیادہ سے زیادہ بالشت بھر پانی کی ندی ہو گی.. اس میں اتنا پانی تو نہ تھا کہ حسن اس میں ڈوب جاتے یا بہہ جاتے اس لیے ہمیں قطعی تشویش نہ ہوئی اور ہم کولہوں پر ہاتھ رکھے اس کے گرد کھڑے اُس کے اٹھنے کے منتظر رہے.. جب وہ نہ اٹھا اور اس کے بال پانی میں تیرتے رہے تو پھر ہمیں تشویش ہوئی.. کہ کہیں خدانخواستہ اس کی کنپٹی پر چوٹ تو نہیں لگ گئی.. ابھی اس تشویش کا آغاز ہی ہوا تھا کہ وہ کمر پر ہاتھ رکھے ہائے ہائے کرتا اُٹھ کھڑا ہوا.. اس کے بازوؤں اور پنڈلیوں پر خون آلود خراشیں تھیں لیکن وہ مزید کراہنے کی بجائے مسکرا رہا تھا..

یہ ایک ایسی ندی نہ تھی جسے پار کرتے ہوئے گرنے کا کوئی بھی امکان ہو سکتا تھا.. نہ اس کے پانی ٹخنوں سے اوپر آتے تھے اور نہ ان میں بہا لے جانے والا زور تھا اور اس کے باوجود کسی ایک پتھر پر جمی کائی پر اس کا پاؤں پھسل گیا تھا.. ہم اس سے کہیں تند و تیز اور گہری سینکڑوں ندیاں عبور کر چکے تھے.. وہاں یہ پاؤں پھسلتا تو بیڑہ پار ہونے کی بجائے غرق ہو جاتا.. شمال میں ایک بڑا ڈر یہی ہوتا ہے کہ آپ بے شک ورگوتھ اور سیاہ ندیاں عبور کر جائیں.. سنولیک پار کر جائیں لیکن ان راستوں میں کوئی ایک پتھر ایسا ہوتا ہے جس پر پاؤں رکھنے سے آپ اجل کی لپیٹ میں چلے جاتے ہیں.. بس اسی نامعلوم پتھر سے ڈرنا چاہیے..

حسن کی خراشوں پر فوراً ڈیٹول کا چھڑکاؤ کیا گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں جو کیمرہ ہوا کرتا تھا اسے پانیوں سے دستیاب کیا گیا بلکہ وہ دو تین ٹکڑوں میں دستیاب ہوا.. اور سفر پھر سے شروع ہو گیا..

ہم ڈھلوان سے اُتر آئے تھے اور اب سامنے کچھ بڑے بڑے پتھر تھے.. جھاڑیاں اور

ریت تھی اور چند معمولی نوعیت کی ندیاں تھیں اور ان کے آخر میں ایک زبردست چڑھائی دکھائی دے رہی تھی جس کی آخری منزل پر ایک پورٹر اٹکا ہوا نظر آتا تھا.. وہ شائد ہمیں دیکھ رہا تھا یہ تسلی کرنے کے لیے کہ کہیں ہم کسی اور جانب نہ نکل جائیں.. چڑھائی آئی کہ بس اجل آئی.. میں نے اپنی ہمت آپ بندھائی اور ہر دو قدم پر رُکتا سرد مگر آکسیجن سے خالی ہوا کو اپنے اندر کھینچتا اوپر چڑھنے لگا.. البتہ میرے یاران تیز گام نے پورٹر کو جا لیا.. اس چڑھائی میں البتہ کوئی خدشہ نہ تھا بس خلا میں اٹھتی ہوئی ایک سیڑھی تھی اور وہاں چھاؤں بھی تھی.. اوپر چوٹی پر دھوپ کی سفیدی تھی.. اور جب میں ہونکتا ہوا وہاں پہنچا ہوں تو کیا کھلا اور پہاڑوں کی بلندیوں اور برفوں کے نشے میں گم ایک منظر آس پاس تھا.. قافلہ لنچ کے لیے رُکا ہوا تھا..

اور ہم کہاں پہنچے تھے..

وہ کوہ قاف کا تخت میدان اور اس میں چرتے یاک اور گھوڑے جو وادی میں اُترتے ہوئے بلندی پر رہ گئے تھے اور ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے.. اب ایک مرتبہ پھر ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے تھے کہ ہم چڑھائی چڑھ کر اس میدان کی سطح پر آ گئے تھے.. لیکن اب وہ منظر بہت پیچھے رہ گیا تھا..

شاہی پیک کی برفیں خاموش تھیں اور اس کے تین ابھاروں پر جمی برف کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ ایک آبشار کی صورت نیچے گرنے لگے..

ہم سب تیز دھوپ میں تھے اور نیچے جو وادی تھی اور اس میں جو ندیاں تھیں وہ چھاؤں میں اُترتی سرد ہو رہی تھیں..

ابراہیم نے یہاں باورچی ہونے کا حق ادا کر دیا.. پہاڑوں میں گھری اس نسبتاً ہموار سطح پر اس نے ہمیں آلو کے گرم گرم قتلے.. نمک اور کالی مرچ چھڑک کر.. ٹماٹو کیچپ ان پر انڈیل کر پیش کیے.. اتنے گرم کہ ہمارے لب جلنے کو آئے.. پھر سوپ پلایا اور آخر میں وہی کریکر پنیر اور مچھلی.. اور اگر کوئی کافی کا شوقین ہے تو کافی بھی.. لنچ سے فارغ ہو کر میں نے ایک سگرٹ سلگایا.. اس کے زہر آلود دھوئیں سے لطف اندوز ہوا اور پھر ایک نیلی ترپال پر لیٹ کر چہرے کو دھوپ سے بچانے کی خاطر اسے فلسطینی رومال سے ڈھک لیا اور اونگھنے لگا.. دیر تک لیٹا رہا.. گھاس کی سرد مہک.. ٹانگوں میں تھکاوٹ کے درد کا سرور.. تازگی بھری سرد ہوا.. میں دیر تک لیٹا رہا.. اور جب میں نے اپنے چہرے سے فلسطینی رومال اٹھایا تو کوچ کا عمل شروع ہو چکا تھا..

"گدھے ہمارے بھائی ہیں.. اور تین بندر.. اور یاک.. جنہیں ایک ہیئر کٹ کی شدید ضرورت تھی"

پورٹر ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے..

میرے ساتھی منزلیں مارتے کہیں اوپر جا چکے تھے.. اور وہاں صرف میں تھا.. عمران اپنے کیمرے کو ایک راکٹ لانچر کی طرح تھامے کھڑا تھا.. ایک پورٹر تھا اور ایک گدھا تھا..

"سر.." اس نے ایک بھاری پتھر میری جیب میں ڈال دیا.. اتنا بھاری کہ اگر میں اپنی سرکی پتلون کے کان نہ تھام لیتا تو وہ اس کے بوجھ سے میرے پاؤں پر گر جاتی.. گر جاتی تو کتنی شرمندگی ہوتی.. مجھے بھی اور دیکھنے والوں کو بھی.. یہ پتھر دراصل ہانگ کانگ سے درآمد شدہ ایک نہایت حساس اور دُور رس نتائج کا حامل مائک تھا.. "سر آج سارا دن آپ فارغ رہے ہیں.. تھوڑی سی ریکارڈنگ کر لیں.. آپ اس گدھے اور پورٹر کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے جائیں اور باتیں کرتے جائیں.."

"گدھے کے ساتھ؟"

"بے شک گدھے کے ساتھ بھی.. جو جی میں آئے کہتے جائیں.. خود کلامی کرتے رہیں اپنا حال زار بیان کریں.. آس پاس کے منظر کو بیان کریں.. یہ مائک ریکارڈ کرتا جائے گا اور مجھے فراموش کر دیں میں جہاں بھی ہوں گا آپ کو شوٹ کرتا جاؤں گا.."

"اوکے باس.." میں نے سرکس کے ایک مسخرے کی طرح ذرا جھوم کر اسے سیلوٹ کیا..

اس نے میرے سیلوٹ کا جواب نہ دیا اور اپنے موڈھے ہوئے دھڑ کو نے سر کو ذرا سا خم دے کر گا گی

اور طاہر کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں بندر ہو گئے.. جی ہاں مونکیز.. وہ تینوں اُچھلتے کودتے کیمرے.. بیٹریاں اور تاریں سنبھالتے بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے چند لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے.. اور پھر تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک وسیع کھائی کے پار چٹانوں میں کیمرہ فٹ کئے مجھے اشارے کر رہے ہیں کہ شروع ہو جاؤ.. ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی.. وہ اتنی دور تھے.. عمران ایک پیدائشی کیمرہ مین تھا.. وہ محض منظر کو بھی نہیں دیکھتا تھا بلکہ اُس مقام کی تلاش میں رہتا تھا جہاں سے اس منظر کو بہترین زاویے سے فلم بند کیا جا سکتا تھا.. اسی لیے اس نے اس ٹیج سناپ پر پہنچتے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر میں اس چڑھائی پر تارڑ اور گدھے کو چلاتا ہوں تو اُدھر کھائی کے پار ایک ایسا مقام ہے جہاں سے میں اس پوری وادی کے پھیلاؤ اور اس میں رینگتے اس تارڑ اور اس گدھے کو بہترین زاویوں سے شوٹ کر سکتا ہوں..

وہ تینوں بندر اُچھل اُچھل کر مجھے اشارے کر رہے تھے کہ چلو چلو..

''باندر کے بچے..'' میں بڑبڑایا ''بندے کو باندر ہی نہیں سمجھتے اپنی طرح کا چڑی باندر سمجھتے ہیں..''

اس بڑبڑاہٹ کے خاتمے سے پہلے ہی مجھے احساس ہوا کہ غلطی ہو گئی ہے.. میری جیب میں جو بھاری پتھر مائک ہے وہ میری ہر قسم کی بڑبڑاہٹ باندر نمبروں تک پہنچا رہا ہے اور اُس شام اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے بتا دیا تھا کہ سر جی جو کچھ آپ ہمارے بارے میں فرما رہے تھے وہ ہم سن رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے.. ویسے ہم تو باندر ہیں لیکن دور سے آپ جو کچھ لگ رہے تھے وہ ہم نہیں بتائیں گے..

تینوں حضرات اُچھل اُچھل کر اشارے کئے چلے جا رہے تھے کہ چلو چلو..

چنانچہ میں نے پورٹر کو اشارہ کیا کہ گدھا سٹارٹ کیا جائے اور پھر اس کے متحرک ہونے پر اس کے پہلو بہ پہلو مختصر بیگ اٹھائے واکنگ سٹک ٹیکتا چلنے لگا بلکہ چڑھنے لگا.. اور حسب ہدایت خود کلامی میں محو ہو گیا.. میں جو جی میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا.. اور ہانپتا لرزتا کہہ رہا تھا.. چڑھائی ذرا دشوار تھی.. اور جو کہہ رہا تھا حیرت در حیرت بزبان انگریزی کہہ رہا تھا.. اور انگریزی بھی ایسی کہ اہل فرنگ بھی دنگ رہ جائیں اور صدمے سے گڈ مین دی لائٹین ہو جائیں..

''ہو ہو.....'' میں اپنے آپ سے بلکہ جیب میں رکھے مائک سے کہہ رہا تھا جس کے

وزن سے میری پتلون کا دایاں حصہ کچھ کھاتا نیچے چلا جا رہا تھا'' ہو ہو تارڑ جی.. تم کہاں ہو.. اور کیوں ہو لیکن یار بلتر جھیلیں بھی کیا جھیلیں تھیں ڈوب مرنے کو جی چاہتا تھا.. لیکن ڈوبنے کے لیے شرط یہ ہے کہ ایک عدد شاہ گوری جل پری تمہارے عشق میں فنا ہو کر تمہارے ساتھ ڈوبنے پر آمادہ ہو جائے.. یار ہم دونوں کے ڈوبنے کا کیا منظر ہوگا.. وہ بدن.. ایک بھالو بدن جس کا کچھ حصہ سفید اور گلابی.. اور بقیہ براؤن ہی براؤن.. اور اس کے ہمراہ ایک جل پری اپنی پُوشل ہلاتی ہوئی ان چھاتیوں کے ساتھ جو سلطنتیں الٹ دیتی ہیں.. اُس کی لمبی گداز ٹانگیں پانی کے رنگوں کے ساتھ رنگ بدلتیں.. لیکن نہیں.. سوری جل پری کی ٹانگیں تو نہیں ہوتیں پُوشل ہوتی ہے اور ڈیم اٹ جل پری میرے ساتھ کیسے ڈوب سکتی ہے وہ تو تیر سکتی ہے اور پانی کی مخلوق ہے.. تو چلیے ہم اکیلے ہی ڈوب جاتے.. اور اب میں کہاں ہوں.. ایک گدھے کے ہمراہ جس کا پورٹر آگے نکل چکا تھا.. ہیلو ڈنکی (میں گدھے کے کان پکڑ کر اس سے فرینڈلی ہوتا ہوں) ہاؤ آر یو مائی فرینڈ.. تم مجھے گدھے دکھائی دے رہے ہو تو میں تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہوں.. (گدھا جواب نہیں دیتا) تم تو مجبوراً یہاں آئے ہو اپنی پیٹ کی خاطر لیکن میں اپنی من مرضی سے یہاں آیا ہوں یعنی گدھا تو میں ہوا.. ہیلو ڈنکی ڈیئر کیا ٹائم ہوگا؟ میرا خیال ہے دو کے لگ بھگ ہوگا.. اس وقت میرے بال بچے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر لیونگ روم میں ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کر رہے ہوں گے.. شاید کسی کو میرا خیال بھی آ جائے کہ ابو اس وقت کہاں ہوں گے.. سلجوق کہتا ہوگا کہ میں پاکستان فارن سروس کا ایک معزز ڈپلومیٹ ہوں اور ذرا دیکھئے میرے والد صاحب اس عمر میں کیا حرکتیں کر رہے ہیں.. اور ڈاکٹر عینی نے فوراً حساب کتاب کیا ہوگا کہ ڈیڈی پتہ نہیں ہائی بلڈ پریشر کی گولیاں روزانہ کھا رہے ہیں یا نہیں.. اسے کیا پتہ کہ میں اس سے کتنا ہائی ہو رہا ہوں.. شاہی پیک اور سنیکیل پیک جتنا ہائی تو پھر میرا بلڈ پریشر کیا ہوا... ہائی ہائی.. ہیلو ڈنکی کیا تم سن رہے ہو.. نہیں نہیں عمران تم سے نہیں کہہ رہا.. سنو میری ایک کتاب کا نام ہے ''گدھے ہمارے بھائی ہیں''.. تو تم ہمارے برادر ہو.. کوئی بات کرو یار..'' بول بول کر میرا سانس اُکھڑنے لگا اور میں اس لایعنی خود کلامی سے تنگ آ گیا اور میں نے مائک کی جانب جھک کر کہا ''اوئے عمران کے بچے.. اگر تم سن رہے ہو تو سن لو کہ بلندی کی وجہ سے اور اپنی عمر کی وجہ سے میں اب مزید بکواس نہیں کر سکتا.. شوٹنگ پیک اپ''

میں اور گدھا خاصی بلندی پر آن پہنچے تھے.. ڈھلوان ختم ہو گئی تھی اور ہمارے سامنے

کہیں بلند پہاڑوں میں گھرا ایک پیالہ نما میدان تھا جس کے چاروں کناروں پر نیلی چٹانوں کی دیواریں تھیں اور برفیلے لبادوں والے پہرے دار کھڑے تھے.. میدان میں کہیں سفید پتھر جمے ہوئے تھے اور کہیں گھاس بلند ہوتی تھی.. کہیں ٹیلوں کی اونچ نیچ تھی.. اور یہ منظر اتنا وسیع اور آسمان کی ہمسائیگی میں تھا اور اتنا اَن چھوا اور دنیا جہان سے الگ تھلگ اور بلند تھا اور اُس لمحے اُس میں صرف میں تھا اور گدھا تھا اور میرا جی چاہا کہ میں اپنی جیب میں بھاری ہوتے مائک کو نکال کر منہ کے قریب کروں اور زور زور سے پکاروں.. شکریہ اللہ جی.. ہائے اللہ جی یہ آپ نے مجھے کیا دکھا دیا ہے.. شائد اللہ جی سُن لیں..

یہ منظر یہ پھیلاؤ.. برفانی قربتوں کی گود میں.. جب کہ سورج ڈھلتا تھا.. سردی بڑھتی تھی اور کہیں نیچے لوئر شاہتی میں یاکوں کے ریوڑ دھول اڑاتے وادی میں اترتے تھے.. یہ منظر کوہ نوردی کے جنون کے لیے قدرت کی جانب سے ایک اور تحفہ تھا.. شکریہ اللہ جی!

ہم بلند تھے..

پہلے لاہور سے گلگت تک کسی قدر بلند ہوئے.. پھر وادی گلتر میں اور بلند ہوئے.. جھیلیں تقریباً وادی کی سطح پر ہی واقع تھیں.. ان کے بعد البتہ ہم لوئر شاہتی میں آسمان کے نزدیک ہوئے.. اور اب وہ قربت تقریباً وصال کو جنم دے رہی تھی اور ہم اس پیالہ نما حیرت میں اُسے چھونے کو تھے.... سردی بڑھتی تھی اور ڈھلتے سورج کی سرد تر شعاعوں میں ہر شے سنہری ہو رہی تھی.. اور یہ سب بندوبست بلکہ گڈ بندوبست اُس کوہ نورد کا منتظر تھا جو ایک گدھے سے باتیں کرتا یہاں تک پہنچ گیا تھا.. یہی لگتا تھا کہ ہم دونوں.. وہ پہلے ملاح ہیں جو ڈوبتے تیرتے اس ویران جزیرے میں آ نکلے ہیں.. پہاڑوں کی اس وسیع جھولی میں آ گئے ہیں..

میں رُک گیا کیونکہ میں بے پناہ تھکاوٹ میں چُور چُور ہو رہا تھا.. اور یوں بھی بلندی کا وہ برفانی اور آسمانی طلسم مجھ پر اثر کر رہا تھا.. وہ شاہ گوریاں میرے دل کو روکتی تھیں..

میں رُک گیا اور گدھا آگے نکل گیا..

اب میں تنہا تھا..

میرے چہرے پر وہی حماقت آمیز مسکراہٹ منجمد تھی جو فاتر العقل لوگوں کا خاصا ہوتی ہے.. اور یہ مسکراہٹ کوئی ایک بار میرے لبوں پر بے اختیار ہوتی تھی.. کوئی ایک بار میں نے حواس کھوئے تھے کہ ان کی تفصیل بیان کروں..

میں گہرے سانس لے رہا تھا اور آنکھوں کو برفوں بلندیوں اور آسمانوں کی نیلاہٹ اور پیالہ نما میدان سے بھر رہا تھا..

میں ابھی تنہا تھا.. اور ابھی کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں چند یاک گردنیں جھکائے ساکت کھڑے ہیں.. ان کے لامبے لٹکتے ہوئے گھنے بال ایک عرصے سے کنگھی پٹی سے ناآشنا تھے.. انہیں کسی ہیئر ڈریسر کی خدمات کی شدید ضرورت تھی..

میں نے ان کی موجودگی کو ناپسند کیا کہ انہوں نے مکمل تنہائی اور برفیلی بلندی پر میری پرائیویسی کو مجروح کیا تھا.. ابھی میں اس مجروحیت کے ماتم میں تھا کہ تینوں بندر بچے اُچھلتے کودتے کہیں سے نمودار ہو گئے..

''واہ تارڑ صاحب..'' عمران باچھیں کھلاتا میری جانب آ رہا تھا..

''واہ جی واہ سر..'' کاظمی نے اگرچہ جبر کر کے اپنے قہقہے کو روکا لیکن باچھیں اس کی بھی کھلی ہوئی تھیں..

''کیا پرفارمنس دی ہے سر.. لونگ شاٹ میں گدھا اور آپ..'' عمران رواں ہو گیا.. اور وہ مجھے بُرا لگ رہا تھا کہ میں ان پہاڑوں میں کھویا ہوا گمشدہ تھا اور کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا نہ کچھ سننا چاہتا تھا'' برفیں ہی برفیں اور اُن کے دامن میں ایک ڈھلوان پر لونگ شاٹ میں کچھ حرکت کر رہا ہے پھر میں زوم اِن کرتا ہوں تو آپ گدھے کا کان پکڑ کر اس سے باتیں کرنے میں مشغول ہیں.. جل پریوں.. شاہ گوریوں اور گلتر جھیلوں کی باتیں.. سر جی یہ ایسا شاٹ ہے کہ نیشنل جیوگرافک چینل پر چلے گا اور تہلکہ مچا دے گا.. کیا میں آپ کو چوم سکتا ہوں''

میں نے ذرا غور سے اور تشویش سے اپنی جانب بڑھتے عمران کو دیکھا.. نیکر ٹوٹو.. چھدری داڑھی.. مونڈھا ہوا دھڑکتا سر اور دبیز شیشوں کی عینک.. میں نے ہاتھ آگے کر دیا'' میرا خیال ہے کہ تم یہ اظہار مسرت رہنے دو.. میں اسے زیادہ پسند نہیں کروں گا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس دوران تم نے کچھ سگرٹ بھی پھونکے ہیں۔''

''نہ پھونکتے سر جی تو اتنے ایکٹو کیسے ہوتے.. اس پورے علاقے میں کھائیاں اور برفیں پار کرتے چوٹیوں پر پہنچتے.. پتھروں کو پھلانگتے آپ کی نظروں سے اوجھل ہم آپ کو شوٹ کرتے رہے ہیں تو کیسے کرتے رہے ہیں.. دھوئیں کے زور سے..''

تمام پورٹر اور ہمارے ساتھی آگے جا چکے تھے..

''کہیں بلند پہاڑوں میں.. رسول حمزہ توف مر چکا ہے''

دن ڈھل رہا تھا..

نیچے میدانوں میں پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے ہوں گے.. اور ہم نے آج شب درّہ ولتر کے دامن میں پہنچ کر اپنے عارضی گھونسلے بنانے تھے.. ہم چلنے لگے.. عمران نے پھر اپنے کیمرے کا رُخ میری جانب کیا ''نہیں.. پلیز اسے آف کردو.. بہت ہو چکا.. اب میں اس پُر سحر اور ایک اَن دیکھے پہاڑی منظروں کے درمیان بلاخوف وخطر.. کیمرے کی گھورتی آنکھ کے بغیر.. چلنا چاہتا ہوں.. آپ چاہے کتنے بھی تجربہ کار.. کتنے بھی گھاگ ہوں.. ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے پوری عمر گزار چکے ہوں پھر بھی جب ایک کیمرہ آپ پر کھلتا ہے.. اُس کا لینز آپ کو فوکس میں لیتا ہے تو آپ وہ نہیں رہتے جو آپ ہوتے ہیں.. میں اب کچھ لمحوں کے لیے وہ رہنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے باس'' اس نے مجھے اسی انداز میں سیلوٹ کیا جس انداز میں شوٹنگ کے آغاز میں.. میں نے اسے سرکس کے مسخرے کی طرح جھومتے ہوئے سیلوٹ کیا تھا..

یہاں چلنا دشوار تھا..

بلندی اگرچہ سانس کو گمراہ کرتی تھی لیکن یہاں نسبتاً ہمواری تھی جس کے باعث چلنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی تھی..

ہم اُس برف کناروں والے پیالے میں چلتے گئے..

پھر ایک مقام پر میں اپنا دم سنبھالنے کے لیے رُکا اور آس پاس اطمینان سے نگاہ کی تو حقیقی معنوں میں میرا دم رُکنے کو آیا..

میرے چاروں اور برف پیراہنوں میں پوشیدہ بلندیاں تھیں.. نیلی چٹانیں اور تنہائیاں تھیں.. سورج ڈھلتا تھا اور ان کی نیلاہٹ.. سفیدی اور تنہائی بھی رو پہلی ہوئی جاتی تھی.. اور انسان

اس بلند سکوت میں بچھڑ چکے.. مر چکے عزیزوں اور دوستوں کو یاد کرتا تھا کہ یہ اکلاپا ان اونچے سنگھاسنوں میں اجل کی قربت میں بھی تھا.. وہ لوگ جو کبھی موت کے دامن تک گئے اس کی ٹھنڈک اور فضا کو محسوس کیا.. اور پھر کسی معجزے سے.. کہ ابھی اُن کے نصیب میں چند سانس اور تھے.. واپس آگئے.. تو جب انہوں نے موت کی نزدیکی کو بیان کیا تو کہا کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم ایک سیاہ غار میں سفر کر رہے ہیں لیکن اس کے آخر میں کوئی روشنی ہے.. ایک نور ہے.. اور کچھ نے کہا کہ ہم کہیں ایک سناٹوں سے بھری بلند وادی میں تھے اور تنہا تھے.. اوڑک جاناں مروے.. چل میلے نوں چلیے..

یہی وہ میلہ تھا جو موت کی نزدیکی میں برپا ہوتا تھا..

یہی پیالہ نما میدان اور اس کے چاروں اور برف لبادوں والے پہرے دار تھے جو تمہیں خوش آمدید کہتے تھے..

اجل کی قربت میں جو وادی تھی.. وہ ایسی ہی ہوگی.. یہاں پر بھی وہی ٹھنڈک اور فضا خاموشی تھی..

اجل کی قربت..

جس روز اجل آئے..

شاہ گوری ایسی اُجلی برفوں کے سفید ہاتھ تمہیں سہاریں تو اجل آئے..

میں اگرچہ ان تینوں سے غافل تھا مگر وہ میرے پیچھے پیچھے آتے تھے..

میں رُکا تو وہ بھی رُک گئے..

اور وہ میری کیفیت سے خوب واقف تھے کہ ان پر بھی یہی اجل تنہائی اترتی تھی..

''عمران.. میں نے ''پاک سرائے'' کے آغاز میں رسول حمزہ توف کی نظم ''اے عورت'' کا حوالہ دیا ہے.. اور یقین جانو کہ جب میں رسول کے قدموں میں بیٹھا اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا تو مجھے یہی احساس ہوا کہ وہ عورت میری طرف بڑھ رہی ہے.. اور اس داغستانی شاعر نے جس کی شاعری کا ترجمہ ''سرِ وادیٔ سینا'' میں فیض صاحب نے کیا ہے مجھے تھپکی دے کر کہا تھا کہ تم بے حد خوش نصیب ہو.. میرے ساتھ یہی پرابلم ہے کہ اگر کوئی غزل یا نظم مجھے پسند آجائے تو پھر اسے بیان اتنا کرتا ہوں کہ اس کا ناس مار دیتا ہوں.. تو جہاں ناس وہاں ستیاناس.. میں نے اپنے ٹیلی ویژن سیریل ''شہپر'' میں اسے تھیم سانگ کے طور پر پیش کیا اور ایک پاپ سنگر نجم شیراز نے جو بے سُرا نہ تھا اسے گایا.. تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں.. تم سن رہے ہو عمران؟''

وہ چونک گیا.. اس کے چونکنے سے اس کے بغل بچے بھی چونک گئے..

"آپ کہئے جو کہنا چاہتے ہیں ہم بھی کچھ منظر اور کچھ دھوئیں کے سحر میں ہیں"

"تو عمران اس بلند مقام پر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا ہے کہ رسول حمزہ توف کی نظم کا آخری بند ان پہاڑوں میں آ کر لکھا گیا تھا.. یہی وہ بلند پہاڑ ہیں جن میں رسول حمزہ توف مر گیا تھا.. میں ایک مرتبہ پھر اس نظم کو رسول کی یاد میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. جہاں وہ مر گیا تھا.. پڑھنا چاہتا ہوں۔"

عمران فوراً چوکس ہو گیا اور اس نے کیمرہ کھول دیا..

کاظمی بیٹریوں کے کمربندے سے بکتر بند ہو کر عمران کے قدموں میں لیٹ گیا اور طاہر نے طاقتور لائٹس آن کر دیں کہ ہم چھاؤں میں ہو رہے تھے..

"تارڑ صاحب.." عمران کیمرے میں پوشیدہ بولا اور مجھے اس کے لینز میں دیکھتے ہوئے مخاطب ہوا "آپ یہ نظم پڑھتے ہوئے میرے گرد گھومتے جائیں گے.. کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈالے اسے پڑھتے جائیں گے.. اور میں آپ کے ارد گرد جو بلند پہاڑ ہیں ان کے پورے سلسلے کو فوکس میں لاتا جاؤں گا.. نظم شروع کرتے ہوئے آپ کی نگاہیں برفوں اور بلندیوں پر ہوں گی اور آپ آہستہ آہستہ میرے گرد ایک چکر مکمل کریں گے اور جب یہ دائرہ مکمل ہو گا تو آپ آخری بند پڑھ رہے ہوں گے.. اور اس کے اختتام پر میں کہیں بلند پہاڑوں میں چلا جاؤں گا.. شروع کریں سر.."

میں نے جب وہ نظم شروع کی تو مجھے قطعی طور پر احساس نہ ہوا.. علم نہ ہوا کہ وہاں عمران بھی ہے اور اس کا کیمرہ مجھے گھور رہا ہے.. میرے ساتھ حرکت کر رہا ہے کہ میں پھر سے تنہا تھا اور وہ نظم مجھ پر اترتی چلی جاتی تھی جسے میں نے رسول حمزہ توف کی خواہش پر آسان اردو میں ڈھالا تھا..

میں جب بھی اس نظم کا حوالہ دیتا ہوں اس کا ترجمہ مختلف ہوتا ہے کہ میں اور اس لمحے کی کیفیت اور ماحول اس پر اثر انداز ہو کر اسے مختلف کر دیتا ہے..

"اے عورت...."

وہ کس عورت سے مخاطب تھا؟"

یقیناً اُس عورت سے جس کے بارے میں گارسیا مارکیز نے کہا تھا کہ ہر مرد.. نامرد ہوتا ہے اور پھر ایک عورت اس کی زندگی میں آتی ہے جو اسے مرد بنا دیتی ہے..

تو رسول بھی اُسی عورت سے مخاطب تھا..

"اے عورت..
اگر ایک ہزار مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو..
جان لینا کہ رسول حمزہ توف ان میں سے ایک ہو گا.."

کہ عشق تو وہ ہے کہ کوئی آپ سے محبت نہ کرے تو آپ اُس سے محبت کریں.. اگر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے اور آپ بھی اُس کی محبت میں مبتلا ہیں تو یہ عشق نہ ہوا کاروبار ہوا.. کہ یہی غرناطہ کی ماریا نے سامبرا ناچتے ہوئے کہا تھا..

"اور اگر ایک سو مرد تم سے محبت کرتے ہوں تو.."

میں کہیں بلند پہاڑوں میں رسول کی نظم اُس کے لفظوں میں نہیں اپنے احساسات کے تابع اپنے حرفوں میں ڈھالتا تھا اور کیمرے کی آنکھ میں تکتا اور اُس کی موجودگی سے غافل بھی اُس کے گرد طواف کرتا جاتا تھا..

"اور اگر صرف ایک مرد..
تو یہ رسول حمزہ توف کے سوا کون ہو سکتا ہے"

اور جب نیشنل لائبریری کے ہال میں اسلام آباد میں رسول حمزہ توف.. داغستان کا امیر الشعراء یہ مصرع پڑھتا ہے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقطع ہے.. لیکن رسول ہاتھ بلند کر کے نظم کا آخری بند پڑھتا ہے..

"لیکن.. اگر تم تنہا ہو.. اور اداس ہو..
اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں..
تو سمجھ لینا کہ.. کہیں بلند پہاڑوں میں..
رسول حمزہ توف.. مر چکا ہے"

یہی وہ بلند پہاڑ تھے..

میں کیمرے کے گرد دائرہ مکمل کر کے آخری بند پڑھنے کے بعد ایک ناتمام سحر میں گرفتہ رُک گیا.. کہ اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا..

تب عمران نے کیمرے میں سے سر نکالا ''یہ رسول حمزہ توف یہاں تو آیا نہیں تو اُس نے کیسے یہ نظم لکھ لی..''

''لیکن میں جو یہاں آیا ہوں..'' میں نے ہنس کر کہا'' کسی بھی بڑے شاعر کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہوتی.. وہ جگہ خود چل کر اس کے پاس آ جاتی ہے..''

''کیا آپ اسی نظم کو انگریزی میں ریسائٹ کر سکتے ہیں؟''

رسول نے یہ نظم اپنی مادری زبان آوار میں لکھی تھی.. پھر ایک ازبک دوشیزہ نے اسے انگریزی میں منتقل کیا جہاں سے میں نے اسے اردو میں ڈھالا اور اب ایک مرتبہ پھر جب میں نے اسے انگریزی میں واپس کیا تو وہ یقیناً اور کی اور ہو گئی.. اور اس کے باوجود اس کی تاثیر میں کوئی فرق نہ آیا جیسے فارسی کی ابتدائی سوجھ بوجھ رکھنے والے فرزیرالله کے اپنے احساسات اس پر حاوی ہو گئے.. کچھ اسی طور یہ نظم اب رسول کی نہیں رہی تھی بلکہ میرے کچے پکے جذبات میں ڈوب کر اور کی اور ہو گئی تھی..

''او وو مین..'' میں نے پھر سے عمران کے کیمرے کو اپنی آنکھ میں رکھا اور اس کے گرد گھومنے لگا..

''اِف اے تھاؤزنڈ مین آر ان لَو وِد یو..

ریسٹ اشورڈ دیٹ رسول.. وِل بی وَن آف دیم..

اور پھر آخر میں..

''اینڈ اِف یو آر رونلی.. ڈیسولیٹ..

اینڈ نو باڈی اِز اِن لَو وِد یو..

دین.. سم وئیر اِن دے ہائی ماؤنٹینز..

رسول حمزہ توف اِز ڈیڈ..''

کہیں بلند پہاڑوں میں.. رسول حمزہ توف مر چکا ہے..

اِز ڈیڈ.. اِز ڈیڈ..

یہ آواز دیر تک بلند پہاڑوں میں گونجتی رہی..

''درّہ ظلتر کے بیس کیمپ سے دھواں اٹھ رہا تھا''

وہ یاک جنہیں ایک عدد ہیر کٹ کی شدید ضرورت تھی ہمارے قریب آ گئے.. بلکہ ہم تھے جو چلتے چلتے اُن کے قریب آ گئے تھے..

انہوں نے تھوتھنیاں اُٹھا کر ہمیں ناراض نظروں سے دیکھا.. انہیں اپنے رکھوالوں کی عادت تھی جو انہیں اس بلند چراگاہ میں چھوڑ کر نیچے جا چکے تھے.. انہیں اس مکمل تنہائی میں اطمینان سے چرتے رہنے کی عادت تھی ہم جیسے حاجی بغلول قسم کے لوگوں کی عادت نہ تھی جو بوجھ اٹھائے.. جیکٹیں پہنے ان کے قریب ہو کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے.. یہ یاک کچھ جنگلی سے ہو چکے تھے.. ذرا قریب ہوتے تو بھینسوں کی مانند دھمکی آمیز خرانٹیں نتھنوں سے نکالنے لگتے.. ہم نے اُن سے کیا لینا دینا تھا تھوڑی دیر اُن کا مشاہدہ کیا اور پھر آگے بڑھ گئے.. میدان کے خاتمے پر کنارہ اونچا ہوا.. اور وہاں ایک اور منظر ہمارا منتظر تھا..

کچھ فاصلے پر چٹانوں اور برفوں کی ایک بلند دیواری ہے اور اس کے دامن میں ایک وسیع گھاؤ ہے.. ایک پھیلاؤ ہے سلیٹی رنگت کا اور اُس میں سے تین چار ندیاں جو پُرشور نہیں تھیں اطمینان سے بہتی اُترتی تھیں اور اُن کے پانی پھیلتے جاتے تھے.. یہ ندیاں درّہ ظلتر کی برفوں میں سے جنم لے کر ایک گلیشیئر میں راستے بناتی نیچے آ رہی تھیں.. درّہ ظلتر ان چٹانوں اور برفوں کی دیوار کے اوپر کہیں تھا.. ہمیں اس منظر کی توقع نہیں تھی کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم بیس کیمپ تک پہنچ گئے ہیں.. ندیوں پر.. گلیشیئر اور اُس بلند دیوار پر شام کے سائے گہرے اور سرد ہو رہے تھے.. ہم آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے اور پہلی ندی کے کنارے پر پہنچ گئے جہاں ابراہیم ہمیں راستہ دکھانے کے لیے رُکا ہوا تھا وہ ہمیں پہلے بالکل دکھائی نہیں دیا تھا اور سرمئی منظر میں گم تھا..

''صاحب آپ کہاں رہ گئے تھے؟''

''کہیں بلند پہاڑوں میں..''

''ادھر تو پہاڑ ہی ہو گا ناں صاحب..میدان تو نہیں ہو گا..اب آگے چلے گا..''

''کہاں..''میں یکدم تھکاوٹ سے چُور ہو گیا..گرنے کو ہو گیا..''آگے کہاں تک چلے گا ابراہیم؟''

''اب تو قریب ہے سَر..ان ندیوں میں اُتر کر پار ہوں گے..آسان ہیں سر خطرناک نہیں..پھر وہ جو اونچا کنارا ہے بہت اونچا اس پر چڑھ جائیں گے..اس کے دوسری طرف نیچے جائیں گے تو پھر ایسی ہی دو تین ندیاں ہیں..بس ان کے پار بیس کیمپ ہے..یہ جو سلیٹی رنگ کی دیوار ہے ناں صاحب اس کے نیچے بالکل..ملتر ناپ کا بیس کیمپ ہے..دور نہیں..اب آگے چلے گا''

سورج کی کچھ مرتی ہوئی سرد شعاعیں تھیں جن کی زردی میں ہم ان ندیوں کے پار ہوئے..یہ تیز تو تھیں کہ ابھی ابھی گلیشیر میں سے برآمد ہوئی تھیں..لیکن زیادہ گہری نہیں تھیں اور ان میں پتھروں کی بجائے ریت کی تہہ تھی..

البتہ جب آخری ندی کے قریب ہوئے تو وہ تند اور خود سر نظر آئی..اس کا شور کان بہرے کرتا تھا..پانی پتھروں سے لڑتے جھگڑتے انہیں دھکیلتے تھے..سفید بھنور بناتے تھے اور اس میں گر کر دوبارہ سنبھلنا مشکل ہو سکتا تھا..اسے احترام سے پار کرنا چاہیے تھا..میں سوچ رہا تھا کہ اس کا احترام کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں سرے سے قدم ہی نہ رکھا جائے..قدم ابراہیم رکھے اور میں اس کے کندھوں پر سوار ہو کر بخیر و عافیت پار ہو جاؤں..یوں بھی میں بار بار جوگرز اُتارتا..جرابیں اُتارتا..ندی پار کر کے پھر سے پاؤں خشک کر کے جرابیں پہنتا..تنگ آ چکا تھا..میں نے ابراہیم کو پکارا تو اس کی جگہ عمران چلا آیا''سر ایک آخری گزارش ہے..ہم تینوں اس کے دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں اور جب ہم آپ کو اشارہ کریں تو آپ پتھروں پر ناچتے بھاگتے ہمارے پاس نہ پہنچ جایئے گا بلکہ ابراہیم کا ہاتھ تھام کر اس میں اُتریئے اور جہاں پانی زیادہ پُر شور اور گہرے ہیں ان میں سے گزرتے ہوئے ہماری جانب آیئے تو کیا زبردست کرائسنگ بنے گی..اگر کہیں گر جایئے تو بس گر جایئے ہم آپ کو نکال لیں گے لیکن شاٹ لینے کے بعد..''

میں نے جھک کر اس برفانی نالے کے پانیوں میں ہاتھ ڈالا تو وہ حسب توقع شل ہو گیا..جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان شہرت اور ناموری کے لالچ میں وہ کچھ بھی

کر گزرتا ہے جو باعزت اور باوقار نہیں ہوتا''میں ابراہیم کے سہارے کے بغیر اس ندی کے پار جاؤں گا..یہ تو معمولی کام ہے''

عمران پار گیا اور کیمرہ آن کر کے مجھے کیو کر دیا..

اتنی دیر میں میں جوگرز وغیرہ اتار کر انہیں ابراہیم کے حوالے کر چکا تھا..میں نے ایک بار کیمرے کے لینز کا تعین کیا کہ رخ اس جانب ہونا چاہیے اور ننگے پاؤں پانی میں اُترا..دو تین قدم مشکل سے اٹھائے لیکن چہرے پر مسکراہٹ اور بے خوفی کھیلتی رہی کہ میں کیمرے کو خوش کر رہا تھا..دو تین قدم اور اٹھائے ہیں کہ اپنی جان پر کھیلنے لگا..کیمرہ اداکاری اور ناموری سب کچھ بھول بھال گیا کہ پانیوں کی یخ بستگی نے میرے پاؤں کو فوراً منجمد کر کے تقریباً مفلوج کر دیا..ٹانگوں کی رگوں کو نیلا کر کے حنوط کر کے انہیں یوں لاچار کیا کہ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے..میں کسی بھی لمحے اوندھا گر سکتا تھا..اصول تو یہی ہے کہ آپ ایسی ندی میں پاؤں رکھئے اور فوراً اٹھا لیجیے تا کہ اس کی برفیلی گرفت اس پر اثر انداز نہ ہو اور اس اٹھے ہوئے پاؤں کو تھوڑی ہوا لگنے دیں اور پھر پانی میں رکھئے..ظاہر ہے اس دوران دوسرے پاؤں کا بھی کچھ خیال رکھنا ہے کہ کہیں وہ انجماد کا شکار نہ ہو جائے..تو پہلے چند قدم تو میں نے اسی اصول کے تحت..کسی ایڈونچر فلم کے جانباز ہیرو کی طرح لاپروائی سے اٹھائے تھے اور پھر جب جان کی بازی بلکہ قلابازی لگنے لگی تو میں اندھا دھند شڑاپ شڑاپ کرتا..پتھروں پر سے پھسلتا..اپنے منجمد پاؤں کو پانی میں سے زبردستی کھینچتا بڑی ہی مشکل سے پار گیا..

''زندہ باد سَر..''کاظمی نے داد دی''ہم نے کیمرہ آپ کے پاؤں پر کلوز کیا تو وہ نیلے ہوتے باقاعدہ دکھائی دیئے..کیا بات ہے سَر..''

''اوئے میرے چہرے کو شوٹ نہیں کیا؟''

''نہیں سَر..''عمران لاپروائی سے بولا''صرف پاؤں شوٹ کرنے تھے''

میرے پاؤں واقعی نیلے پڑ چکے تھے..جرابیں پہنیں تو یوں لگا کسی اور کے پاؤں میں پہنا رہا ہوں..

اس ندی کے دوسری جانب کوئی باقاعدہ کنارا نہ تھا..چند بڑے بڑے پتھر تھے اور وہیں سے ایک باریک کنکروں اور بھر بھری مٹی کی دیوار نما بلندی اونچی ہوتی جاتی تھی..اس پر ایک باریک راستہ تھا..جس پر یاک ہی چڑھ سکتے تھے..اس پر انسان اگر تازہ دم ہو..سویرے ہو تو کچھ

احتیاط سے چڑھ سکتا تھا لیکن دن ڈھلے.. ایک طویل مسافت کے بعد اور وہ بھی نیلے رنگ کے پاؤں کے ساتھ چڑھنا نہایت ہی ذلت آمیز فعل تھا.. چنانچہ خوب ذلیل ہوتے اوپر پہنچ ہی گئے..

اوپر پہنچے تو پھر نیچے بھی آئے.. ایک مٹیالی اور سلیٹی رنگ کی پانیوں کی گزرگاہ.. جس میں اِدھر اُدھر ریتلی زمین میں پانی بہہ رہے تھے.. اُن کی روانی میں نہ کمینگی تھی اور نہ کوئی شور.. اطمینان سے شریفانہ طور پر بہہ رہے تھے.. اس گزرگاہ کے دوسری جانب ایک شام کی تاریکی میں آتی ہوئی سرمئی دیوار تھی جو دُور تک چلی گئی تھی.. اور اس کے دامن میں ہماری آج کی خیمہ گاہ تھی جہاں ہم اپنے اپنے خیموں کے رنگ پہچان سکتے تھے کہ پورٹر وہاں کب کے پہنچ چکے تھے اور ہمارے خیمے ایستادہ کر چکے تھے.. کچن کی نیلی ترپال میں سے سفید دھواں اٹھ رہا تھا.. بلکہ سرد فضا میں معلق تھا..

یہ ہلتر درے کا بیس کیمپ تھا..

کچھ زیادہ خوش نظر نہیں لگتا تھا..

جہاں سے دھوپ رخصت ہو چکی تھی.. سردی میں ٹھٹھرتا ایک ویران اور اداس سا مقام تھا.. جس کی اداسی کو ہمارے خیموں کے شوخ رنگ بھی زائل کرنے میں ناکام ہو رہے تھے..

لیکن یہ منزل تھی.. وہاں پہنچ کر ہم نے اپنے بوجھ اُتارنے تھے اور جو گرز اتارنے تھے اور خیموں کے اندر گھس کر لم لیٹ ہو جانا تھا..

بیس کیمپ ہلتر ٹاپ!

کیا یہی وہ مقام ہے جہاں رسول حمزہ توف مر گیا تھا.. اگر وہ مر گیا تھا تو میں کیوں زندہ ہوں..

”گوشے میں پہاڑوں کے مجھے آرام بہت ہے“

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے..

مجھے نہیں تھا..

پہاڑوں کے قفس میں.. درہ ہلتر کا بیس کیمپ ایک گوشے میں تھا.. لوئر شانی سے جو برف بلندیاں شروع ہوئی تھیں وہ اس درّے کے قریب پہنچ کر ختم گئی تھیں کہ ان کے آگے ایک فصیل کھڑی تھی جس کے سائے میں ہم خیمہ زن تھے..

لیکن اس گوشے میں مجھے آرام نہیں تھا..

میں سلیپنگ بیگ میں پڑا کروٹیں بدلتا تھا.. اور کروٹ آزاری ایسی تھی بدن کا ہر گوشہ دکھتا تھا.. کباب سیخ کی مانند جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو.. خیمے کے باہر برف سناٹے میں ٹھٹھریلی سردی تھی جو باہر تھوڑا ٹھہرتی تھی.. خیمے کے اندر آتی تھی اور میرے تھکاوٹ سے ٹوٹتے بدن میں برف کی کرچیاں بھرتی تھی..

میاں صاحب اور شاہد باہر اس عظیم دیوار کی اوٹ میں جس کے اوپر کہیں درہ ہلتر براجمان تھا ابراہیم کے چولہوں کے قریب آگ کے قریب ہوتے ہانڈیوں میں ڈوئیاں چلاتے تھے.. اور نمک مرچ چکھنے کے بہانے اپنی بھوک کا بندوبست کرتے تھے..

برابر کے خیمے سے.. برابر اس لیے کہ اس خیمہ گاہ میں اتنی وسعت نہ تھی کہ خیمہ ہم سے دور لگایا جائے.. برابر کے خیمے سے گدلا اور گرد آمیز کی سرگوشیاں اور ہلکے قہقہے مجھ تک آتے تھے..

اور وہ جو آج کہیں بلند پہاڑوں میں اُچھلتے ناچتے بندر ہو گئے تھے پھر سے انسانوں کی جون میں آ گئے تھے.. خیمہ گاہ سے نیچے اتر کر اس آخری ندی کے کنارے کسی پتھر پر جا بیٹھے تھے

اور تاریکی میں مکمل طور پر روپوش تھے اور صرف جب کش کھینچا جاتا تھا اور ان کے خصوصی سگرٹ کا جگنو پل بھر کے لیے سلگتا سرخ انگارہ ہوتا تھا تو اُن کی وہاں موجودگی کا پتہ ملتا تھا.. یہ خیمہ گاہ بھی ایک چھوٹی سی یاک سرائے تھی..

میں اس سرائے میں سب سے آخر میں داخل ہوا تھا.. اور ساتھیوں کی ہیلو ہائے کے بعد سیدھا اپنے خیمے.. یعنی وہ خیمہ جو سلیم کا تھا اور میں اس کا شریک بن چکا تھا اس میں گھس کر لم لیٹ ہو گیا تھا.. لیکن میں نے خیمے کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ سلیم خیمہ گاہ کے آس پاس منڈلاتے چرتے یاکوں کو نہایت ہی دل جمعی اور دلچسپی سے دیکھ رہا ہے کہ وہ اُس کے پہلے یاک تھے اور اسے پسند آ گئے تھے.. وہ اپنی مونچھیں سنوارتا ان پر مسکراہٹیں نچھاور کرتا ان کے قریب قریب ہو کر ان سے اٹھکیلیاں کرنا چاہتا تھا اور وہ کرنے نہیں دیتے تھے بیزار بیٹھے تھے.. بلکہ کھڑے تھے.. اور ناراض نظروں سے اُسے دیکھتے ذرا پرے پرے ہوتے تھے..

باہر رات ہو گئی.. اور مزید سردی ہو گئی.. ہم تقریباً ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر خیمہ زن تھے..

جب رات ہو گئی تو خیمے کا پردہ وا ہوا اور سلیم جھکا جھکا اندر آ گیا اور بیٹھ گیا ''سر جی یاک چلے گئے ہیں.. یہ کہاں چلے گئے ہیں؟''

''یار میں تو خیمے میں پڑا اپنی خراشیں سہلا رہا ہوں.. مجھے کیا پتہ کہاں چلے گئے ہیں''

''میں بہت دیر تک ان کے قریب بیٹھا رہا.. انہیں پچکارتا رہا.. چاکلیٹ کھلانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے.. پھر تاریکی ہوئی تو وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک ایک کر کے کھسک گئے.. پتہ نہیں کہاں گئے ہیں.. کہاں گئے ہیں سر جی؟''

سلیم عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا.. وہ اتنی بلندی پر پہلی بار آیا تھا اسی لیے بہک گیا تھا.. ہم سب یعنی قدیمی گروپ اس بیس کیمپ سے کہیں بلند درجات پر فائز ہو چکے تھے.. کنکورڈیا میں.. بیس کیمپ نانگا پربت اور درّہ درکوت میں اور سب سے بلند سترہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند درّہ دیسپر میں.. اس لیے ہم یہاں محض ساڑھے بارہ ہزار فٹ پر بہکتے بھی تو کتنا بہکتے.. اس لیے میں نے سلیم کو اُس عیاش بوڑھے کی نظر سے دیکھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے اور اُس کے سامنے ایک ایسا نوجوان ہے جو کسی گھاٹ سے پہلی بار پانی پی کر آیا ہے اور حیران اور خوش ہے کہ اچھا پانی ایسے ہوتے ہیں..

''سر آپ پانی پئیں گے؟''

''کون سے گھاٹ کا پانی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا'' وہی منرل واٹر ہے جو میں اسلام آباد سے لیکر آیا ہوں تا کہ پیٹ خراب نہ ہو..''

''یار میں نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور میں کبھی پیٹ کی خرابی کا شکار نہیں ہوا.. آپ اپنے معدے کو جتنی آسانیاں دیں گے.. چھان پھٹک کر.. اُبال اُبال کر اگر پانی پئیں گے تو وہ اتنا ہی خودسر ہو جائے گا.. بے شک برالڈو کا پانی پیو.. جو بڑ میں سے دو گھونٹ بھر لو.. معدہ اس کا بھی عادی ہو جائے گا..''

''لیکن سر یہ تو منرل واٹر ہے..''

''مائی ڈیئر یہ جو درجن بھر ندیاں ہماری خیمہ گاہ کے برابر میں گلیشیئر میں سے بہتی آ رہی ہیں اور جن کے بہاؤ کی آواز ہمارے کانوں میں آ رہی ہے اور جن میں سے آخری ندی کے کنارے عمران اینڈ کمپنی کے سگرٹ کے جگنو دمکتے ہیں وہ بھی تو خالص منرل واٹر ہے.. کیوں نہ ہم باہر نکلیں اور ڈیک لگا کر اسے پی لیں.. پیو کہ مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید..''

''لیکن سر.. اب میں جو یہ تین پلاسٹک کی منرل واٹر کی بوتلیں اسلام آباد سے اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں تو ان کو بھی تو ختم کرنا ہے.. اور یقین کریں یہ ہمارے میدانوں کا پانی ہے اور اس میں تاثیر بہت ہے.. ذرا چیک کریں''

میں نے چیک کیا..

وہ برف ہو رہا تھا لیکن اُس میں کچھ پوشیدہ سی تاثیر تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی.. شاید یہ اپنی مٹی کے پانی تھے.. اپنے میدانوں سے کشید کردہ تھے اور ان میں دراصل سرسوں کے کھیتوں کی.. مکئی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی.. اور کیکر کے زرد پھولوں کی تاثیر تھی..

خیمے کی چھت سے ایک چھلے میں بندھی ٹارچ لٹکتی تھی اور اس کی بیٹری کمزور پڑتی تھی سردی کی شدت کے باعث لاچار ہوتی تھی اور روشنی زرد ہوتی جاتی تھی.. ہم دیر تک باتیں کرتے رہے.. بلندی کے باعث بہکی بہکی باتیں کرتے رہے..

خاموشی بہت تھی..

''گدا..'' میں نے صدا دی..

برابر کے خیمے سے سرگوشیاں یکدم منقطع ہوئیں اور ایک سرد سی "جی سائیں" کی آواز جواب میں آئی..

گدا ہمیشہ سے ہر ٹریک کے دوران میوزک سیکشن کا انچارج رہا تھا اور وہ جہاں اپنے رُک سیک میں سے عمر عیار کی پوٹلی کی مانند ہر شے برآمد کر کے پیش کر دیتا تھا وہاں کسی بھی سنولیک یا شمشال میں آپ کی فرمائش پر کوئی بھی گیت یا غزل یا عارفانہ کلام اپنے ڈیک پر سنوا سکتا تھا.. نہ صرف ہمیں سنواتا تھا بلکہ اُس کی تال پر رقص کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا..

"یار جب سے یہ ٹریک شروع ہوا ہے تم نے موسیقی نہیں چھیڑی.. کوئی 'جان بہاراں رشک چمن غنچہ دہن' کوئی استاد جمن کی 'یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے' کچھ لگاؤ کہ سناٹا بہت ہے.. کچھ چھنکو یار.."

"موسیقی کا موقع نہیں ہے سائیں.." اُدھر سے بے حد روکھا جواب آیا..

"کیوں گدا بھائی.." سلیم نے پوچھا.. "یہی تو موقع ہے.. آواز بلند کر دینا تا کہ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے انجائے کریں"

"موقع نہیں ہے.. سائیں گرد آمیز ابھی نماز پڑھیں گے.."

"سوری گدا.." میں قدرے خجل ہو کر چپ ہو گیا لیکن چپ ہونے سے پیشتر میں نے ایک اور صدا دی "سائیں گرد آمیز کی نماز بھی تو ختم ہو گی پھر لگا دینا.."

اب ہم دونوں آپس میں باتیں نہیں کر رہے انتظار کر رہے ہیں کہ بلندی کی اس سرد تنہائی میں ہم موسیقی کے راستے کسی جانِ بہاراں کی قربت میں جانے کے تمنائی تھے.. ایک مناسب وقفے کے بعد میں نے پھر پکارا "گدا.. اگر سائیں گرد آمیز نماز پڑھ چکے ہیں تو لگا دو سائیں جمن کو.."

"اب سائیں گرد آمیز آرام کر رہے ہیں اور یوں بھی میوزک کو ناپسند کرتے ہیں تارڑ صاحب.."

اس کورے اور روکھے جواب کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی.. اس لیے کہ میں انسانی خصلت کو نہیں جانتا تھا.. گرگٹ ہو جانے اور رنگ بدلنے کو نہیں جانتا تھا.. تو ظاہر ہے میں مزید خجل ہوا.. بے حد شرمندہ بلکہ بے توقیر ہوا اور جواب میں کچھ نہ کہا.. جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے.. دوش میرا تھا کہ میں نے ان پتوں پر کیوں تکیہ کیا تھا.. اُنہیں گمنامی سے ناموری تک لے آیا تھا تو دوش میرا تھا..

سردی بڑھتی جاتی تھی..

یہ کچھ چپ چپ سی ایکسپیڈیشن تھی..

ہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے نہ تھے..

جڑنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہم بغل گیر ہو کر ہمہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ چپکے رہیں.. بوس و کنار میں مشغول رہیں.. نہیں.. بے شک آپ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ ہم کلام نہ ہوں.. اپنے آپ میں گم رہیں اور پھر بھی ایک مشترکہ نبض آپ کے درمیان دھڑکتی رہے.. کچھ کہے بغیر ایک نظر ڈالنے سے آپ جان جائیں کہ آپ کے ہم سفر کو آپ کی ضرورت ہے.. ایک رابطہ.. ایک دوسرے کے لیے فکر مندی آپ سب میں مشترک ہو.. جو اس مہم کے ارکان میں نہیں تھی..

اس میں ایک بکھراؤ تھا.. ہم سب بظاہر پہلو بہ پہلو چلتے تھے لیکن ایک دوسرے سے آگاہ نہیں تھے..

شائد یہ کیفیت اُس فرقہ واریت کا ثمر تھی جو عمران اور اُس کے بندر بچوں اور دوسری جانب گدا اور گرد آمیز کی علیحدگی پسندی کے باعث ظہور میں آئی تھی..

جو کچھ بھی تھا یہ سب میرا کیا دھرا تھا.. میری ذاتی حماقت تھی.. کیونکہ میں نے ہی یہ بھان متی کا کنبہ جوڑا تھا..

اگر میں نے یہ کنبہ جوڑ ہی دیا تھا تو کم از کم کنبے والے ہی کچھ لحاظ کرتے جو انہوں نے نہیں کیا اور گرگٹ ہو گئے..

ہم نیلے ترپال پر بیٹھے تھے اور کھسکتے ہوئے الاؤ کے قریب ہوتے تھے تا کہ منجمد نہ ہو جائیں.. ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے اس کی ناکافی بھڑک میں پلیٹ میں نظر آتے.. کبھی کبھار اس بھڑک سے نظر آتے سالن میں سے فوراً لقمہ لگا لیتے کہ وہ پلیٹ اگلے لمحے تاریکی میں ڈوب جاتی..

چپ کا راج تھا.. سوائے الاؤ کی بھڑک کے..

"ابراہیم.." میں نے خاموشی.. اور شدید انجماد میں ٹھٹھرتی سردی میں کانپتے ہاتھوں سے خاموشی کا قفل کھولنے کی سعی کی.. اس کا لوہا اتنا سرد تھا کہ بمشکل کھلا "صبح ہم درّہ ظفر کراس کریں گے؟"

"ہاں صاحب.."

''کیسے؟''

''یہ جو دیوار ہے چٹانوں کی.. تاریک اور مہیب.. کل سویرے ہم اس پر چڑھیں گے.. یہاں سے مشکل دکھائی پڑتی ہے لیکن ہے نہیں.. آپ بھی چڑھ جاؤ گے انشاء اللہ.. اور اوپر کچھ بڑے بڑے پتھر آئیں گے.. چٹانیں اور برف آئے گی اور پھر ایک گھنٹے کے بعد ہم چوٹی پر پہنچ جائیں گے جہاں سے درّہ ہلتر سامنے آجائے گی''

''گلیشیر بہت بڑا ہے؟''

''بڑا تو ہے صاحب.. ان علاقوں میں یہ سب سے بڑا گلیشیر ہے..''

''بیافو.. ہیسپر اور بالتورو سے تو بڑا نہیں؟''

''نہیں صاحب.. وہ تو دنیا جہان ہے.. برف کا دنیا ہے.. اُدھر تو اُن کے اندر چلے جاؤ تو پھر قسمت سے ہی باہر آتا ہے.. ہم تو وہاں نہیں گیا.. صرف سکردو کا پورٹر.. بلتی لوگ ہی اس کے اندر جا سکتا ہے.. ہلتر ٹاپ سے تو ہم ایک دو گھنٹے میں پار ہو جائیں گے انشاء اللہ.. اگر برفباری نہ شروع ہو گیا..''

''برفباری؟'' ہم سے بہت الگ.. ایک فاصلے پر.. تاریکی میں.. ایک پتھر پر براجمان کاظمی جو کھانا کھا چکا تھا اور اب اپنے آپ میں مگن کبھی ہنستا تھا اور کبھی توجّہی اٹھا کر شاہنی پیک کو گھورتا تھا.. اور جس نے شائد پوری گفتگو میں صرف ''برفباری'' کا لفظ ہی سنا تھا.. چونکا ''کیسی برفباری؟''

عمران اپنے خیمے میں جا چکا تھا تو وہ وہیں سے بلند آواز میں بولا ''اوئے کاظمی.. ویسی برفباری''

''کیسی برفباری یار..'' کاظمی تقریباً جھنجھلایا..

''بس ویسی ہی برفباری جیسی کہ برفباری ہوتی ہے''

''اچھا اچھا میں سمجھا تھا کہ ویسی برفباری جیسی کہ برفباری نہیں ہوتی'' یہ کہہ کر کاظمی اپنے پتھر پر شانت ہو گیا اور ہتھیلی پر تمباکو مسلتے ہوئے مزید شانتی کا بندوبست کرنے میں مشغول ہو گیا..

یہ گفتگو تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ حسن صاحب نے ''کیا بات ہے.. اور کونسی بات ہے'' کے سلسلے میں کل لوئر شاہنی میں کی تھی..

یہ پُرفخر اور فلسفیانہ برف بار مکالمہ اختتام کو پہنچا تو میں نے پھر سے سلسلہ کلام شروع کیا

''اگر برفباری شروع ہو جاتا ہے تو پھر کیا ہو گا ابراہیم؟''

''صاحب پھر دیکھیں گے.. اگر تو کم برف اُترتا ہے تو آگے جائیں گے اور اگر بہت ہے اور رُکتا نہیں ہے برف پڑتا جاتا ہے تو ہم ادھر نیچے نہیں واپس اُتر آئیں گے اور اس کے رکنے کا انتظار کریں گے.. لیکن پرواہ نہیں ہے صاحب.. پار جائیں گے انشاء اللہ''

''گلیشیر میں دراڑ تو نہیں؟''

''نہیں صاحب.. بہت نہیں.. دو چار دس تو ہو گا.. گلیشیر میں دراڑ تو ہوتا ہے صاحب ورنہ وہ گلیشیر کیسا.. لیکن ادھر کوئی آسانی سے گرتا نہیں جب تک کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو.. درّے کے پار ہو کر ہم پھورا وادی میں اُتریں گے اور اسی نام کے گلیشیر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے شام تک سُرخ پتھر تک پہنچیں گے..''

''راستہ کیسا ہے؟''

''بس مسافت ہے صاحب..''

''خوبصورت ہے؟''

''پتہ نہیں صاحب.. بہت بار ادھر آیا ہے لیکن کبھی غور نہیں کیا.. بس مسافت ہے''

جیسے مجھ سے کوئی پوچھے کہ تارڑ صاحب آپ جب اپنے گھر سے.. گلبرگ سے نکلتے ہیں اور شہر جاتے ہیں.. اپنے ناشر نیاز احمد کے پاس سنگ میل جاتے ہیں تو کیا راستہ خوبصورت ہے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ بس مسافت ہے.. میں اُس قبرستان کو تو نہیں دیکھوں گا جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی شہزادی بمباں سدرلینڈ دفن ہے.. نہر کنارے خزاں رسیدہ پاپلر یا اُس کے پانیوں میں ڈوبتی بید مجنوں کی شاخوں پر غور نہیں کروں گا.. راستے میں پڑتی ٹریفک لائٹس پر غور نہیں کروں گا.. نہ لکشمی مینشن کو دیکھوں گا جہاں منٹو رہتا تھا.. نہ اس پوسٹ آفس پر نظر کروں گا جہاں راجندر سنگھ بیدی ہوا کرتا تھا.. نہ ہی موہنی روڈ میں امرتا پریتم کو دیکھوں گا اور نہ.. عجائب گھر کے سامنے زمزمہ توپ پر توجہ دوں گا جس پر رڈیارڈ کپلنگ کا کردار کم براجمان ہوا کرتا تھا.. میرے لیے تو یہ ایک معمول کی.. رزق کی تلاش کے لیے.. ایک محض مسافت ہو گی..

''کیسی برفباری ہوگی.. ویسی جیسی کہ ہوتی ہے اور مدیحہ شاہنی''

کاظمی اپنے پتھریلے سنگھاسن پر سے اُٹھا اور ہمارے قریب آ بیٹھا ''سر جی اگر کل برفباری شروع ہوگئی تو ویسی ہی برفباری ہوگی ناں جیسی کہ برفباری ہوتی ہے؟'' اس کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی..

میں نے اس لمحے کاظمی کو بے حد پسند کیا.. اس برفانی گود میں کہیں بلند پہاڑوں کی تنہائی میں وہ ہماری طرح سوگوار نہیں تھا.. زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا..

''جیسی کہ کونسی برفباری ہوتی ہے کاظمی؟''

''کوئی بھی برفباری جیسی وہ ہوتی ہے ویسی برفباری''

''یقین کرو یہ ویسی ہی ہوگی جیسی کہ ہوتی ہے..''

''سر جی یہ میری پہلی برفباری ہوگی تو اس لیے پوچھ رہا ہوں.. آپ مائنڈ تو نہیں کر رہے؟''

''نہیں کاظمی.. کوئی اور سوال؟''

''سر جی.. مائنڈ نہ کرنا لیکن آپ نے کبھی برف جیسا گوراپنڈا دیکھا ہے؟'' اس کے پورے دانت اندھیرے میں لشکے..

''دیکھا بھی ہو تو میں تمہیں تھوڑا بتاؤں گا.. تم ایک جونیئر بچے ہو اور اپنی حیثیت کو ہمہ وقت یاد رکھو کاظمی..''

''سوری سر'' اس نے سر جھکا لیا اور اتنا ملول ہوا کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا..

''اوئے کاظمی..'' میاں صاحب بھی اکھاڑے میں اُتر آئے'' بچے آج تو بندروں کی

طرح پہاڑوں میں اُچھل کود کر رہے تھے ناں.. کل کرنا.. کل جب گلیشیئر پر چلیں گے ناں.. اور اس میں ہوتی ہیں دراڑیں.. اور جب اُچھلتے ہوئے ان میں سے کسی ایک میں گر گئے ناں تب پوچھنا کہ گوراپنڈا کیا ہوتا ہے.. نیچے ہر طرف برف ہی برف ہوگی اور اندھیرا ہوگا اور تم ناں کاظمی منٹوں میں برف کا لازمی حصہ بن جاؤ گے''

''جانے دیں میاں صاحب''

''کہاں جانے دیں''

''کہیں بھی جانے دیں''

میاں صاحب اس جواب سے بے حد خفا ہوئے اور کاظمی سے منہ موڑ کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

''یہ نامہ نیم پتہ نہیں کہاں ہے تارڑ صاحب.. بات سمجھتا ہی نہیں''

''یہ وہاں ہے جہاں سے اس کو اپنی بھی خبر نہیں آتی میاں صاحب.. اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں''

''ٹن ہے؟'' میاں صاحب نے نہایت رازداری سے پوچھا..

''نہیں.. ٹن تو نہیں لیکن بہر حال کچھ اور ہے..''

''بڑا نامہ نیم ہے'' میاں صاحب بڑبڑائے..

''کاظمی..'' عمران کی آواز خیمے میں سے برآمد ہوئی..

''یس باس'' کاظمی فوراً کھڑا ہو گیا اور عمران خیمے میں لیٹے ہوئے جانتا تھا کہ کاظمی اس کے پکارنے پر کھڑا ہو گیا ہوگا اس لیے اس نے پھر آواز دی'' کاظمی بیٹھ جاؤ..''

''بیٹھ گیا باس''

''اب یہ بتاؤ کہ طاہر کہاں ہے..؟''

''میرا خیال ہے وہ یاکوں کے پیچھے گیا ہے یہ جاننے کے لیے کہ یہ رات کو کدھر جاتے ہیں..''

اس پر سلیم نے مسرت کا اظہار کیا'' یار یہ تو میں بھی جاننا چاہتا تھا..''

''ویسے وہ یاکوں کے پیچھے نہیں گیا'' حسن صاحب بھی بالآخر اپنی شرماہٹ سے باہر آئے'' وہ کسی اور حاجت کے لیے نیچے ندی کے کنارے جو پتھر ہیں ان کی اوٹ میں گیا ہے.. ابھی تک وہیں بیٹھا ہے.. کش لگاتا ہے تو سگرٹ نظر آتا ہے''

''کاظمی اس کا پتہ کرو کہیں ندی میں لڑھک ہی نہ گیا ہو'' عمران خیمے میں قہقہے لگانے لگا۔۔

''باس اگر وہ لڑھک گیا ہے تو اب تک عطر کی جھیل میں جا گرا ہو گا پتہ کرنے سے فائدہ'' یہ کہہ کر کاظمی بھی اپنے باس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔۔

''تارڑ صاحب'' میاں صاحب نے پھر سرگوشی کی'' یہ اس مرتبہ آپ اپنے ساتھ کیا اٹھا لائے ہیں۔۔عجیب جانگلوس قسم کی چیزیں ہیں۔۔''

''ہاں تو میاں صاحب جانے دیں۔۔'' کاظمی قہقہے سے فارغ ہو کر پھر میاں صاحب سے مخاطب ہو گیا۔۔اب مجھے بھی شک ہوا کہ وہ جان بوجھ کر یملا بنا ہوا ہے۔۔۔محض باندر بنے پر تلا ہوا ہے ورنہ مکمل طور پر اپنے حواس میں ہے۔۔

''جانے دیا۔'' میاں صاحب بھی اس کی عیاری سمجھ گئے۔۔

''لیکن سر۔۔تارڑ صاحب۔۔'' وہ انگلیوں سے سرد مٹی میں ایک نقشہ سا بنانے لگا'' میں اگرچہ ایک جونیئر بچہ ہوں پھر بھی آپ مجھ سے یہ تو پوچھ لیجیے کہ میں نے برف سفید چنڈے کے بارے میں کیوں پوچھا تھا۔''

''کیوں پوچھا تھا؟''

''دراصل آج جب آپ نے وہ کہیں بلند پہاڑوں والی نظم پڑھنی تھی اور میں نے باس کے کہنے پر آپ کی بنیان تلے سے ہاتھ گزار کر آپ کی ٹی شرٹ کے گلے میں ٹیک مائک لگایا تھا تو اس وقت مجھے وہ گورا چنڈا یاد آ گیا تھا۔۔''

''کس کا چنڈا؟''

ابراہیم اپنے گھٹنوں پر سر رکھے سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ یہ سمجھ جائے کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں لیکن سب کچھ اس کے سر سے گزر رہا تھا۔۔

محسن صاحب کے چہرے پر ایک عجیب الوہی اور پُرسکون مسکراہٹ کھیل رہی تھی اگرچہ اس کی خراشوں میں سے ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھی جنہیں وہ ہونٹ بھینچ کر برداشت کرتا تھا۔۔میاں صاحب بھی اس رات میں خوش تھے۔۔کبھی اپنی عینک درست کر کے مسکراتے اور کبھی منہ بنا لیتے۔۔

البتہ شاہد ابھی تک اپنے سفید جاسوسی ہیٹ سے جدا نہیں ہوئے تھے اور اپنی موٹی عینک کے پیچھے سے ایک متروک شدہ فلسفی الو کی مانند آنکھیں جھپکاتے تھے۔۔

عمران اپنے خیمے میں تھا اور گفتگو کے دوران وہیں سے لقمے دیئے جا رہا تھا۔۔سلیم شائد سونا چاہتا تھا اور بمشکل آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔۔

گدا اور گرد۔۔شائد سو چکے تھے۔۔شائد جاگ رہے تھے۔۔

اس ٹریک میں ایک اور افسوس ناک بات سامنے آئی۔۔پورٹر بھی فرقہ واریت کا شکار تھے۔۔چنانچہ جو سنی عقیدے کے تھے وہ الگ رات بسر کرتے تھے اور جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے ان کا ڈیرہ الگ ہوتا تھا۔۔

جب میں نے کاظمی سے جو اس شب ہماری واحد تفریح تھا یہ پوچھا کہ کس کا چنڈا تو وہ بڑے اشتیاق سے بیان کرنے لگا'' سر جی آپ تو ہمیں جونیئر سمجھ کر گھاس نہیں ڈالتے۔۔حقیر سمجھتے ہیں لیکن میں ٹیلی ویژن کا ایک نہایت ہٹ پروگرام'' لالی ووڈ'' بھی پروڈیوس کرتا رہا ہوں۔۔اور اس دوران فلم انڈسٹری کی بڑی بڑی۔۔بدن میں بھی بڑی بڑی اداکاراؤں کو شوٹ کرتا رہا ہوں۔۔ تو جناب عالی آپ خود میڈیا کے بندے ہیں جانتے ہیں کہ شوٹ کرنے سے پہلے آواز کے لیے ٹیلنٹ کو ٹیک مائک لگانا پڑتا ہے۔۔کچھ خواتین تو خود ہی لگا لیتی ہیں اور کچھ کہتی ہیں کہ کاظمی بھائی۔'' اور یہاں اُس نے ہی ہی کر کے کاظمی بھائی کاظمی بھائی کی گردان کی'' کہ کاظمی بھائی آپ خود ہی لگا دیں۔۔تو تارڑ صاحب میں ایک اچھے بھائی کی طرح۔۔نہایت ادب اور احترام کے ساتھ جس طرح آپ کو لگایا تھا تو ان کی شمیزوں اور قمیضوں وغیرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے گلے میں مائک لگا دیتا ہوں اور سر جی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اکثر کے نیچے کچھ نہیں ہوتا صرف پیڈنگ ہوتی ہے۔''

''اوئے ہوئے تو یہ سب جعلی کام ہوتا ہے؟'' میاں صاحب کو بے حد افسوس ہوا۔۔

''کاظمی۔۔تم بہک رہے ہو۔۔تم کسی ایک برف گورے بدن کی بات کر رہے تھے''

''سوری سر۔'' وہ پھر شرمندہ اور اتنا رنجیدہ ہوا کہ مجھے پھر اُس پر ترس آنے لگا

''تو سر آئی ایم سوری میں ذرا آف ٹریک ہو گیا۔۔تو ایک مرتبہ وہ مدیحہ شاہ نہیں ہے؟''

''ہاں ہے شائد۔۔''

''سر مدیحہ شاہ دیا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔۔شائد نہیں ہوتی''

''کاظمی۔۔'' میں نے سینہ پھلا کر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی'' یہ جو مدیحہ شاہ ہے یہ اوّل اوّل میرے ڈرامہ سیریل'' سورج کے ساتھ ساتھ'' میں انٹرویوس ہوئی تھی اور اب بھی اگر اتفاقاً کہیں آمنا سامنا ہو جائے تو ایک استاد کی حیثیت سے اتنا احترام کرتی ہے کہ باقاعدہ

بغل گیر ہو کر ملتی ہے.. کیا سمجھے؟''

''تارڑ صاحب آپ کی بغل اتنی بڑی ہے کہ وہ اس میں گیر ہو جاتی ہے..'' کاظمی نے بکواس کی..

''تارڑ صاحب.. یہ نام نیم کہیں اور ہے.. اس سے بچیں..'' میاں صاحب فکر مند ہو گئے..

''کاظمی.. براہ کرم تمیز سے بات کرو.. محض مدیحہ کی تمیز کی بات کرو''

''سوری سر..'' اس نے پھر معذرت کی..

یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اس لمحے کہیں بلند پہاڑوں میں ایک سیاہ رات میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ذرہ ملتر کے بیس کیمپ کی ٹھٹھرتی رات میں ہر کوئی ہمہ تن گوش تھا اور کاظمی کی یاوہ گوئی میں غرق تھا.. آنکھیں نہیں جھپکتا تھا..

''تو سر.. میں اپنے پروگرام کی شوٹنگ کر رہا تھا.. اور جب میں نے ریکارڈنگ کے لیے نیک مائک کو چٹکی میں پکڑ کر کہا کہ محترمہ مدیحہ شاہ صاحب آپ اس چیز کو اپنے گلے میں کہیں بھی لگا لیں تو وہ کہنے لگی کاظمی بھائی آپ ہی لگا دیں.. تو میں نے مجبوراً ایک پروفیشنل پرابلم کو حل کرنے کے لیے اس کی سکڑتی ہوئی اور تنگ.. جین پر اٹھتی ٹی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈالا ہے نیک مائک سمیت تو اسی لمحے اس کی والدہ محترمہ جو شائد پان لینے ذری کی ذری سٹوڈیو سے باہر گئی تھیں واپس آ گئیں اور مجھے اس عمل میں مصروف دیکھ کر کہنے لگیں ''وے منڈیا.. جدھر تم مُٹھتے میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہو اُدھر تک آتے آتے تو بڑے بڑے اپنے خزانے خالی کر دیتے ہیں اور تب آتے ہیں'' تو تارڑ صاحب مجھے بے حد غصہ آیا کہ مائی جی میری نیت پر شک کر رہی ہیں تو میں نے ہاتھ فوراً باہر نکال لیا اور کہا اماں جی پھر یہ کام تم خود کر لو.. اس پر اماں جی جو پتہ نہیں کتنے جہان دیدہ تھیں فوراً بولیں.. نہیں پتر.. میں سمجھی تم کچھ اور کر رہے ہو.. لیکن تم تو انٹرویو کر رہے ہو.. تو کر لو..''

تارڑ صاحب بس کیا بتاؤں کہ کیا برف گورا چٹا تھا..'' کاظمی نے ایک ہچکی بھری اور خاموش ہو گیا.. اس ہیجان خیز داستان نے یقیناً سب کو گرما دیا بلکہ ملتر گلیشیئر اور تین سروں والی ملتر چوٹی کی برفوں کو بھی قدرے پگھلا دیا..

سب کو چپ لگ گئی..

''ویسے..'' بہت دیر بعد سلیم نے ایک کھنگورا مارا ''شاہ کی مونث تو شاہنی کہلاتی ہے ناں.. تو یہ جو لوئر شاہنی ہے.. اور اب جس اپر شاہنی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو یہ کہیں مدیحہ کے نام پر تو نہیں''

''دُر فٹے منہ..'' میاں صاحب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ''اوئے کن پوتر اور ستھری چیزوں کو کس سے ملا دیا ہے..''

''ویسے سر.. میں تو لوئر شاہنی سے اپر شاہنی تک مائک لے کر گیا تھا میں جانتا ہوں کہ بلندی کیا چیز ہوتی ہے..'' کاظمی نے نہایت فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا.. کہ وہ اس قصے کے بعد قدرے محترم ہو گیا تھا.. ''سر جی.. میں ابھی آتا ہوں..'' وہ قلانچیں بھرتا ہوا الاؤ کی روشنی سے رخصت ہوا.. تاریکی میں اُترا اور پھر اپنے پسندیدہ پتھر پر جا براجمان ہوا.. تھوڑی دیر بعد اس تاریکی میں سگرٹ کا ایک جگنو ٹمٹمانے لگا..

یہ سفر اس لائق تو نہ تھا کہ اسے بیان کیا جاتا.. لیکن اس کے کردار ایسے تھے جو بیان کے جانے کے لائق تھے.. کیا آپ اتفاق کرتے ہیں؟

''درّہ غلتر اور گلیشیئر کے پار.. ایک مجبوری برفباری''

نیلے گگن پر سفید بادل اُمڈتے تھے..
نیلے گگن کے تلے..

اور ان سفید بادلوں میں ساون کی گھنگھور گھٹاؤں ایسے کچھ بادل تھے جو نیلاہٹ پر بچھے جاتے تھے.. ایک سرمئی دُھند کی مانند..

پتھروں کے ایک وسیع ملبے کے اوپر.. بلندی پر.. جہاں آسمان تھا.. جب کہ میں چڑھائی چڑھتا اپنے پھیپھڑوں کی ناتوانی کو سانس سے بھرنے کی جستجو میں منہ کھولے ہانپتا تھا اور جب رُک کر اوپر دیکھتا تھا تو نیلے گگن پر سفید اور سرمئی بادل اسی رنگ کے ہاتھیوں کی مانند مستی میں جھومتے اٹھتے تھے..

تو وہاں.. مجھ سے بہت اوپر جہاں آسمان دکھائی دے رہا تھا وہاں میرے ساتھیوں کی رنگا رنگ جیکٹیں منظر میں.. ایک پتھروں سے اٹے ہوئے خشک منظر میں.. رنگ بھر رہی تھیں.

سُرخ.. نیلی اور زرد جیکٹیں.. حُسن کا نیلا رین کوٹ.. گرد آمیزکی ٹامی سُرخ پی کیپ.. وہ سب وہاں پہنچ چکے تھے اور میں پیچھے رہ گیا تھا اور اب ان کو نظر میں رکھتا اوپر آ رہا تھا..

کل کی شب اگر گزری تھی تو ظاہر ہے آج کی صبح بھی ہوئی تھی..

اور جب صبح ہوئی تھی اور میں اپنے خیمے سے باہر آیا تھا تو کچن کی نیلی ترپال کے قریب ایک پتھر کے گرد بہت سارے یاک دنگا کر رہے تھے.. لڑ جھگڑ رہے تھے آپس میں بھڑ رہے تھے اور اس پتھر پر پڑی کسی سفید شے کی چاہت میں پاگل ہوتے تھے..

معلوم ہوا کہ وہ شے.. نمک کا ایک ڈھیلا ہے..

عمران یاکوں کو نزدیک سے شوٹ کرنا چاہتا تھا اور وہ نزدیک نہیں آتے تھے تب ایک پورٹر نے بتایا کہ صاحب یاک.. نمک کے بے حد شوقین ہوتے ہیں.. نمک چاٹنے کو مل جائے تو اپنی یاکی کو بھول جاتے ہیں چنانچہ ان کو پاس بلانے کے لیے ایک پتھر پر نمک کا ایک ڈھیلا رکھ دیا گیا تھا اور اسے چاٹنے کی جستجو میں ایک دوسرے کو دھکیلتے تھے اور عمران انہیں کلوز رینج میں شوٹ کر رہا تھا..

مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ آزادی سے پیشتر نسبت روڈ اور گوردوارجن نگر کی دکانوں کے تھڑوں پر ہندو حضرات عبادت کے طور پر گئو ماتا کی خوشنودی کے لیے نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھ دیتے تھے.. اور گائیں سارا دن اس نمکین ضیافت سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھیں.. ان مسلمان یاکوں کی خصلت بھی قدرے ہندو لگتی تھی کہ نمک چاٹنے کے لیے اپنے برادران اسلام کو ٹکریں مارتے تھے..

یاکوں کے اس دنگے فساد کے علاوہ میرے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے آج صبح میں ایک اور دھچکا تھا..

اس خیمہ گاہ کو ہم نے ڈھلتی شام میں اور پھر تاریکی کی اُداسی میں دیکھا تھا اور اس کے آس پاس اور پس منظر میں جو کچھ تھا وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہا تھا.. ہم اگرچہ ایک بلند اور بے روح فصیل کے سائے میں تھے لیکن ہم وہاں تھے جہاں شاہی پیک کے تینوں گنبد چھو لینے کی نزدیکی میں تھے.. نیچے ندیاں تھیں.. گلیشیئر تھے اور نہایت برفانی حیرت کدے تھے..

ہم پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ گزیں یہ نہ جان سکے کہ ہم کہاں خیمہ زن ہیں.. صرف صبح نے.. اور سورج کی اولین کرنوں نے آس پاس کی بلندیوں پر جب اپنی روشنی نچھاور کی تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم کہاں تھے.. اور ہم ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے محض تاریکی اور تھکاوٹ کے باعث..

ناشتے کے فوراً بعد ہم اس چٹانی فصیل پر چڑھنے لگے جس کے دامن میں ہم نے رات گزاری تھی اور چیونٹیوں کی طرح چڑھنے اور رینگنے لگے..

یہ چڑھائی اتنی بھی آسان نہ تھی جتنی کہ ابراہیم نے بیان کی تھی.. اس میں دو چار سخت مقام بھی آتے تھے.. یہ مقام جان لیوا تو نہیں تھے لیکن بدن لیوا ضرور تھے..

اس بلند فصیل کے اوپر پتھروں کی ایک سلطنت آتی تھی..

اور یہاں ہم سب اپنے اپنے دکھ میں.. مشقت میں.. الگ الگ ہو گئے..

بلند پتھریلے کنارے تھے جن پر چلتے ہوئے آپ اپنا توازن کبھی برقرار رکھتے تھے اور کبھی نہیں رکھتے تھے..

وہاں زمین نہ تھی.. گھاس بھی نہ تھی.. محض پتھر تھے جن پر چلتے چلتے.. کہ انہی پتھروں پر چل کر.. اگر آ سکو تو آؤ.. ہم اگرچہ نہیں آ سکتے تھے لیکن آئے کہ ہم مجبور اور لاچار تھے..

اور جب میں نے ایک بار اوپر دیکھا اور نیلے گگن تلے رنگ رنگ کی چند جیکٹیں دیکھیں.. افق پر کچھ برف پوش آثار نظر آئے تو مجھے ڈھارس ہوئی کہ ہاں اوپر ایک بلند درّہ.. ایک گلیشیئر ہو سکتا ہے ورنہ ہماری خیمہ گاہ سے اوپر دیکھتے ہوئے یہی گمان ہوتا تھا کہ اوپر کچھ بھی نہیں ہے..

اوپر دیکھتے ہوئے اور پھر چڑھتے ہوئے یہی خدشہ تھا کہ جب میں ٹاپ پر پہنچوں گا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوگا..

لیکن جب میں اُن جیکٹوں کو نظر میں رکھتے ہوئے بلند ہوتا وہاں تک پہنچا تو وہاں کچھ تھا..

وہ وہاں تھا..

پتھروں کی بادشاہی کی سنگ دلی کے بعد جب میں اوپر پہنچا تو وہ وہاں تھا..

ایک ہموار سطح پر یکدم اس کا آغاز ہو جاتا تھا.. برف زار سامنے تھے.. اور تاحد نظر تھے.. ان کا.. اس برف سفید کائنات کا کوئی انت نہ تھا.. کوئی حساب نہ تھا..

میں نے درّہ ظفر کو اپنے زعم میں.. سنو لیک اور بالتورو کے بعد اتنا معمولی سمجھ لیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک کاغانی گلیشیئر ہوگا جس پر سے درجنوں جیپیں بھی آسانی سے گزر جاتی ہیں.. لیکن یہ تو ایک باقاعدہ اور معزز گلیشیئر تھا.. جس کے کناروں پر جتنی بھی بلندیاں تھیں ازلی برفوں میں ڈھکی ہوئی تھیں.. نہایت چپ اور منجمد تھیں..

یہاں سے دائیں جانب اترنے سے آپ پھورا کے راستے پر آتے تھے اور اگر برفوں کی مسافت طے کرتے بائیں جانب رخ کرتے تھے تو حیال درّے کے پار چتور کھنڈ میں جا نکلتے تھے.. دیانتر درّے کا راستہ بھی یہیں سے نکلتا تھا..

یہ جو وسیع گلیشیئر یکدم ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو گیا تھا اس میں صرف ایک ہی خوبی نظر آتی تھی کہ یہ بدن دریدہ نہ تھا.. کم از کم جہاں سے ہم اسے دیکھ رہے تھے وہاں سے نہ تھا.. اندر کے بھید ہم نہیں جانتے تھے.. جیسا کہ پہلی ملاقات میں ایک بظاہر معصوم اور نہایت نیک

خصلت دکھائی دیتی خاتون کے بارے میں آپ یہ نہیں جان سکتے کہ پوشیدگی میں اس کا بدن کیا ہے.. دریدہ ہے یا نہیں..

یہاں چائے کے لیے وقفہ ہوا..

ہم ظفر گلیشیئر کی اس وسعت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے..

یہ درّہ تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا..

اگرچہ وسیع تھا لیکن اس کے باوجود ہماری نظر اس کا احاطہ کر سکتی تھی..

ہمیں دائیں جانب اترنا تھا..

ہم نے.. ہمارے پورٹروں نے اور ہم نے اس پر قدم رکھا تو اس کی برف سخت تھی.. نرم نہ تھی کہ چلنے میں دشواری ہوتی.. یہ بس ہمارے جوگرز کے نیچے آ کر کرچ کرچ کرتی اور ہمیں گزر جانے دیتی.. اس میں کوئی کھائی کوئی گہرائی نہ تھی.. یہ کسی حد تک کھیل تماشا تھا.. بلکہ پتھروں اور پگڈنڈیوں کی نسبت اس پر چلنا آسان تھا.. محض ماحول بنانے کی خاطر ہم نے اسے تشویش سے دیکھا پھر ذرا چلنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی.. صرف بلندی مشکل میں ڈالتی تھی اور سانس سنبھال کر چلنا پڑتا تھا..

ہمارے دیکھتے دیکھتے نیلے گگن پر جو بادل تھے وہ گھنے ہوتے گئے اور پھر ایک دھندی چھا گئی.. موسم خراب ہو رہا تھا.. لیکن ہمیں پروا نہ تھی ہم موسم سے بھی زیادہ خراب تھے.. آہستہ آہستہ آگے پیچھے چلتے رہے.. نیچے ہوتے گئے..

اور تب جب ہم اس کے درمیان میں پہنچے ہیں اور ہمیں پتھروں کا وہ سرخ کنارہ نظر آنے لگا ہے جس پر ہم نے برف کی دنیا چھوڑ کر اترنا ہے تو.. برفباری شروع ہو گئی.. یہ کوئی باقاعدہ بھاری.. دفن کر دینے والی برفباری نہیں تھی.. مینہ کی بوندیں تھیں جو جماؤ میں آ کر سفید ہو گئی تھیں.. جم گئی تھیں اور ہمارے چہروں اور جیکٹوں پر گرنے لگی تھیں.. اور گرتے ہی پگھل بھی جاتی تھیں..

پہلا سوال ظاہر ہے کاظمی کی جانب سے آیا ”سر یہ کیسی برفباری ہے؟“

”یہ ویسی ہی برفباری ہے جیسی کہ برفباری ہوتی ہے“

”مجھے قبول ہے..“ وہ پھر سے بندر ہو گیا اچھلتا کودتا برف کو چہرے پر ملتا وہ اپنی زندگی کی پہلی برفباری انجوائے کر رہا تھا..

ہاں زندگی کی پہلی برفباری تو ہر شخص کے لیے ایک ہیجان خیز طلسم ہوتی ہے.. جیسے پہلی

محبت میں در کھلتے ہیں.. جیسے کرسمس کی شب میں اپنے کالج کے پرنسپل کے گھر میں مدعو نوجوان طالب علم پیانو پر بیٹھی اس کی حسن آمیز بیٹی کی صرف ایک نگہِ التفات کے منتظر ہوتے ہیں تو کوئی مہمان اندر داخل ہو کر اطلاع دیتا ہے کہ.. باہر برفباری ہو رہی ہے..

یا مانچسٹر میں بھاری برفباری کے فوراً بعد ایک جنگل ہے جس کی ہر شاخ سفید ہے اور جب برف کا بوجھ بڑھتا ہے تو وہ جھک کر اسے خالی کرتی ہے تو سناٹے میں سرسراہٹ ہوتی ہے اور میری لینڈ لیڈی کا گھگھنا سا کوش ٹیریئر کنواری برف کی دبیز تہہ میں دھنسا جاتا ہے اور اس کے بالوں کے گرد برف کے گولے بن جاتے ہیں اور جب وہ چل نہیں سکتا تو میں اسے گود میں اُٹھا کر گھر لے آتا ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھ کر اس کے بالوں کی برف پگھلاتا ہوں..

یا ریڈ سٹار کیمپ کی سویر میں ہماری نظروں کے سامنے سرسبز پہاڑ سفید ہوتے ہوئے کہ برفباری نے ہمیں آ لیا تھا..

تو برفباری.. پہلی برفباری پہلی محبت کی مانند ہیجان خیز ہوتی ہے اسی لیے میں کاظمی کی کیفیت سے آگاہ تھا.. اگرچہ یہ کوئی خاص برفباری تو نہ تھی صرف بارش تھی جو سفید ہو کر برس رہی تھی ..میری سفید چترالی ٹوپی کی سفید اون کو مزید سفید کر رہی تھی.. میری نیلی جیکٹ پر سفید پھول گراتی تھی.. میرے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں پناہ لیے ہوئے تھے لیکن وہ میرے کانوں پر گرتی انہیں یخ کرتی تھی.. انہیں بے حسی کے قریب لے جاتی تھی.. بائیں ہاتھ پر برفپوش پہاڑ اونچے تھے اور وہاں یقیناً اس برفباری میں شدت آ چکی تھی.. ہم دائیں جانب اُتر رہے تھے..

''کیوں میاں صاحب کچھ روح میں بالیدگی پیدا ہوئی؟'' میں نے میاں صاحب کو پکارا..

وہ رُک گئے سوچ میں پڑ گئے'' تارڑ صاحب بہت زیادہ سوچیں تو شائد تھوڑی سی پیدا ہو جائے ورنہ یہ گلیشیئر تو مال روڈ ہے.. ہاں البتہ برفباری نے اس کی کراسنگ میں کچھ چاشنی پیدا کر دی ہے''

گلیشیئر کی ہمواری میں یکدم ایک وسیع اور چوڑی دراڑ سامنے آ گئی..

اسے دیکھ کر کسی پورٹر نے'' یا ہو یا ہو'' کا نعرہ بلند کیا بلکہ اسے ٹاپ کر آگے چلے گئے البتہ عمران' کاظمی' طاہر اور گرد آمیز خوش ہو گئے کہ یہ ان کی زندگی کی پہلی برفانی دراڑ تھی.. وہ اس میں جھانکتے'' ہوئے اوئے'' کرتے پُرمسرت ہوتے تھے..

''سر جی..'' کاظمی میرے پہلو میں آ گیا.. میں اس میں گرنا نہیں چاہتا.. اگرچہ اس کے اندر گر کر مجھے پتہ چلے گا کہ.. بقول میاں صاحب.. گوراپنڈا کیا ہوتا ہے لیکن میں اس میں گرنا نہیں چاہتا''

''تو نہ گرو.. ذرا اوپر چلے جاؤ جہاں اس دراڑ کا اختتام ہوتا ہے وہاں سے دوسری جانب چلے جاؤ''

''نہیں سر.. میں اسے بے جگری سے کراس کرنا چاہتا ہوں.. اسے ناپنا چاہتا ہوں..''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ صبح سے تم نے کتنے سگرٹ پئے ہیں؟''

اس نے کانوں کی لویں چھوئیں'' نہیں سر.. قسم لے لیں جو صبح سے ایک سُوٹا بھی لگایا ہو..''

''تو پھر ناپ جاؤ''

کاظمی نے ایک جست لگائی اور دراڑ سے کہیں آگے جا کر لینڈ کر گیا.. گرا اور کھڑا ہو گیا اور کپڑے جھاڑ کر انگلیوں سے'' وی'' کا نشان بناتے ہوئے نہائت فخر سے اعلان کیا ''سر جی آپ اپنی کتابوں میں خواہ مخواہ دراڑوں سے ڈراتے رہتے ہیں.. یہ تو معمولی کام ہے.. بچوں کا کھیل ہے..''

اس پر میاں صاحب کو تاؤ آ گیا مڑ کر بولے'' اوئے کاظمی دراڑوں کی بے حرمتی نہ کر بچے.. انہیں معمولی نہ کہنا.. بچے یہ گشتی رن کی طرح تمہیں اپنے اندر کھینچ لیتی ہیں اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا.. ہم سے پوچھو ہم سے'' انہوں نے اپنا مرغ بادنما سینہ تھپکا'' بیافو پر کوئی قدم دراڑ کے بغیر نہیں ہوتا.. چھی بوئی اور درکوت میں جو قہر بلائیں دراڑیں ہوتی ہیں وہ تمہارے جیسے بچے نگل کر ڈکار بھی نہیں لیتیں.. وزہ دیسپر سے نیچے اُترتے ہوئے برفتے والی دراڑیں ہوتی ہیں یہ بھی خالد ندیم سے پوچھنا کہ ان میں گرنے سے قبل بندے پر کیا گزرتی ہے.. یہ ذرا معصوم سی دراڑ ہے اس کے آگے متھا ٹیک اس کا شکریہ ادا کر کہ یہ اپنی بہنوں جیسی آدم خور نہیں ہے.. دراڑوں کی بے حرمتی نہ کر..''

''نہیں کرتا میاں صاحب..'' کاظمی سہم گیا اور کان لپیٹ کر چلنے لگا..

برفباری کو شائد ہماری بے اعتنائی پسند نہ آئی اور وہ صرف ہمیں متاثر کرنے کی خاطر باقاعدہ اور گھنی ہو گئی.. اتنی زیادہ کہ ہمیں راستہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا.. ہر شے سفید ہو گئی.. نظروں کے سامنے جو کچھ تھا وہ سب کا سب سفیدی کے لبادے اوڑھنے لگا.. یہاں تک کہ تمام کوہ نورد بھی سنو مین دکھائی دینے لگے.. گدا اپنے گرد آمیز کو سہارا دیئے گلیشیئر کے پار لے جا رہا تھا..

لیکن یہ کچھ لمحوں کا کھیل تھا.. برفباری میں کچھ کمی آ گئی..

آسمان کی نیلاہٹ اور سرد رنگت میں البتہ کمی نہ ہوئی.. جیسے سویر ہونے کو ہو.. ابھی نیلا اندھیرا ہو.. کچھ سلیٹی سی سرد اداسی ہو..

گلیشیئر کا کنارہ آ گیا.. ہم اُس پر سے اُتر کر سرخ پتھروں پر آ گئے..

پتھروں پر قدم رکھا ہے تو برف سردیلی بارش میں بدل گئی.. جیسے وہ صرف درّہ ملتر کے لیے ہی گرتی تھی.. پتھروں پر گرنا اُسے پسند نہ تھا..

ہم سانس لینے کے لیے رُک گئے.. درّہ ملتر پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے رُک گئے..

اپنے بدنی حجم کے مطابق پتھر تلاش کر کے اُن پر براجمان ہو گئے اور بارش مسلسل ہوتی چلی جاتی تھی..

عمران نے اپنے قیمتی کیمرے کو بارش سے بچانے کی خاطر ایک برساتی پہن رکھی تھی اور وہ اس میں سر دیئے ہماری تھکاوٹ اور ٹھٹھرتی بے بسی کو فلم بند کرنے میں مشغول تھا..

اس کے کیمرے کا رُخ زرد جیکٹ اور ٹامی پی کیپ میں ملبوس نرم اور گداز ٹیڈی بیئر گردآمیز کی جانب ہوا ''ہیلو ٹامی.....''

گردآمیز اپنا سانس درست کر رہا تھا.. گدا کے کندھے کا سہارا لیے ہونک رہا تھا.. اور گدا اس عزت افزائی پر کہ گردآمیز ایسی اہم ملتانی شخصیت اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے ہے نہایت پاکیزہ اور معطر محسوس کر رہا تھا..

جب گردآمیز نے کوئی جواب نہ دیا تو عمران نے پھر پکارا کیونکہ اس کی فلم ضائع ہو رہی تھی ''ٹامی.. گڈ بوائے ٹامی.. اس طرف دیکھو پلیز اور درہ ملتر کو پار کرنے کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرو.. کم آن ٹامی..'' گڈ بوائے ٹامی نے کیمرے کی جانب چہرہ کیا اور ذرا شرما کر.. ذرا لجا کر کہا'' یہ تو تارڑ سائیں کی مہربانی ہے اور گدا کا سہارا ہے کہ ہم ادھر آ گئے..''

''نہیں سر..'' عمران نے برساتی میں سے کلام کیا ''اردو میں نہیں.. انگریزی میں اپنے تاثرات ریکارڈ کروائیں ہو سکتا ہے یہ ڈاکومنٹری انٹرنیشنل سرکٹ پر چلے''

ٹامی نے جو تاثرات ریکارڈ کروائے وہ ایسی انگریزی میں تھے جو سرائیکی سے جدا نہ ہوتی تھی.. لمحہ بھر کے لیے اگر جدا بھی ہوتی تھی تو پھر سے اداس ہو کر اُسے جپھا مار لیتی تھی.. دیگر ساتھیوں کی انگریزی بھی تربتر ہو گئی.. البتہ حسن صاحب قدرے سرخرو ہے کہ ان کی بیگم امریکیوں

کو اردو پڑھاتی ہیں اور وہ انہیں انگریزی پڑھاتے ہیں.. سلیم چونکہ یوں بھی ملٹی نیشنل تھا اس لیے وہ اس پُل صراط سے بخوبی گزر گیا.. بھلا اُس پر کون انگلی دھرے.. اور میری انگریزی کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ میری اردو سے بھی زیادہ کمزور ہے.. چنانچہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کتنی کمزور ہوگی.. بلکہ جاں بلب ہوگی.. پچھلے کئی روز سے کیمرے کی خاطر انگریزی بول بول کر میرا بھیجہ نرم پڑ گیا تھا.. کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی میری انگریزی پر گرفت سی اے ٹی.. کیٹ.. کیٹ معنی بلی.. اور آر اے ٹی.. ریٹ.. ریٹ معنی چوہا سے آگے نہیں بڑھی تھی..

میاں صاحب نے البتہ انگریزی کو دھوبی پٹڑہ دیا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر گویا کہتے تھے.. اوئے نامہ نیم اب بول..

شاہد صاحب چونکہ ذرا خفیہ طور پر منمنا کر بات کرتے تھے اس لیے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کونسی زبانی میں گفتگو کر رہے ہیں..

اگرچہ ملتر گلیشیئر اپنے تئیں خاص معزز اور مناسب گلیشیئر تھا.. لیکن یہ ہمارا پہلا گلیشیئر نہ تھا اس لیے ہم اس کی عزت نہ کر سکے.. اگر ہوتا تو اسے عبور کرنے پر ہم اپنے آپ کو شرپا تن زنگ اور ایڈمنڈ ہلیری کے ہم پلہ ضرور سمجھتے..

ہم ذرا آرام کرنے کے بعد گلیشیئر کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے پتھروں.. تالابوں اور گیلی بجری پر قدم جماتے نیچے وادی میں اُترنے لگے اور پھر.. ایک مرتبہ پھر برف پر آ گئے کیونکہ ملتر گلیشیئر کی دُم وادی میں اتر رہی تھی.. اور یاد رہے کہ ہم وادی ملتر سے جدا ہو چکے تھے اس لیے ادھر یہ پھورا گلیشیئر کہلاتا تھا.. گلیشیئر کی یہ وسیع دُم بہت دور تک جاری تھی.. ہم نے اسے ناپسند کیا.. یہ تو کوئی بات نہیں کہ ہم اسے عبور کر آئے تھے اور اب ایک مرتبہ پھر اس کی پونچھل پر.. اُس کے سرد بہاؤ پر ہمیں سفر کرنا تھا.. یہ تو کوئی بات نہ تھی.. صریحاً زیادتی تھی..

یہ برف بالکل پتھر تھی.. اس پر بے دھیانی اور اطمینان سے نہیں چلا جا سکتا تھا.. قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا.. اگرچہ ہماری پھونکوں سے وہ پگھلتی نہیں تھی..

بلندی البتہ کم ہوتی گئی..

یہاں تک کہ درّہ ملتر نظروں سے اوجھل ہو گیا.. اوپر رہ گیا..

لیکن یہ ایک عجیب اُلو کی دُم گلیشیئر کی دُم تھی جو پوری وادی کو بھرتی تھی اور ختم نہ ہوتی تھی.. بائیں ہاتھ پر بھی برف انباروں سے ڈھکے پہاڑ تھے.. موسم گدلا اور بے لطف تھا اور ٹانگوں

میں جتنی سکت تھی نچڑ چکی تھی..درّے کو عبور کرنے کا چاؤ اور چلبلاہٹ دم توڑ چکی تھی اور تھکاوٹ اس طور زیر کرتی تھی جیسے دم نکال کر رہے گی..

کہیں کہیں اکا دکا دراڑیں بھی منہ پھاڑے منتظر ہوتی تھیں لیکن ہم ان کو منہ نہ لگاتے تھے..

اس برف زار پر چلتے مدتیں بیت گئیں..

درّہ خنجر محض دکھاوا تھا آزمائش تو اب شروع ہوئی تھی..

طاہر ایک ایسے سنو مین کی طرح جس کی تعمیر میں خرابی واقع ہوگئی تھی..شپ شپ کرتا..لمبے لمبے ڈگ بھرتا..نہ احتیاط کرتا اور نہ یہ دیکھتا کہ آگے کیا ہے منہ اٹھائے وادی کو دیکھتا ایک ناقص روبوٹ کی مانند چلتا جارہا تھا..

البتہ کاظمی پھر سے اداس ہو گیا تھا ''سر جی..اب برفباری نہیں ہوگی؟''

''شائد نہیں..کیونکہ ہم بلندی کم کرتے نیچے ہو رہے ہیں''

''اور اگر ہم واپس بلندی پر چلے جائیں تو وہاں برفباری ہو رہی ہوگی؟''

''وہاں جا کر دیکھ لو..''میں نے چڑ کر کہا..

''اور سر وہاں پتہ ہے کیسی برفباری ہو رہی ہوگی..ویسی جیسی کہ برفباری ہوتی ہے''

میں اب مسکرانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا..

''کاظمی تم نے کبھی دریا میں قدم رکھا ہے؟''

''کیوں نہیں سر جی..راوی میں بہت بوٹنگ کی ہے..نہائے بھی ہیں''

''تو دریا کے پانی کبھی ایک جیسے نہیں رہتے..جن پانیوں میں تم ایک بار اُترتے ہو دوسری بار اُترنے سے وہ پانی نہیں رہتے..وہ گزر گئے ہوتے ہیں..وہ ایک اور دریا ہوتا ہے..ایسے ہی برفباری ہوتی ہے..تم بے شک دوبارہ اوپر درّے تک چلے جاؤ لیکن اب وہاں جو برف گر رہی ہوگی وہ نہیں ہوگی جو ایک گھنٹہ پیشتر تم پر روئی کے سفید گالے اُتراتی تھی..اب وہ سفیدی اور ہوگی وہ گالے اور ہوں گے اور تمہیں پہچان نہ پائیں گے..تو دوبارہ اوپر جانے سے فائدہ؟''

''ہاں فائدہ..''اس نے سر ہلایا ''اگرچہ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں لیکن فائدہ..''

''برف کا ایک بگولا..ایک واورولا..جس کی نیلی برفوں کے کنویں میں سے میرے اباجی کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں''

ہم سے کچھ فاصلے پر پورٹروں کا قافلہ رُکا ہوا تھا..برف کی سفیدی پر ہمارا سامان ڈھیر تھا..ایک ایک رُک سیک اور ڈرم جیسے سفید کینوس پر رنگین تصویر کی صورت میں دکھائی دیتا تھا..میاں..شاہد..حسن اپنی ورکنگ سٹکس برف میں گاڑے کھڑے تھے..نہایت اداس اور سنجیدہ جیسے کوئی ٹریجڈی ہو گئی ہو..انہیں یوں کھڑے دیکھ کر میرا دل دھڑکا..شائد کوئی حادثہ ہو گیا ہے..کوئی پورٹر دراڑ میں گر گیا ہے..

میں تیز تیز چلتا اور پھسلتا قریب ہوا تو وہاں کھڑے ابراہیم نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں مجھے خبردار کیا ''صاحب سیدھے مت آؤ..ذرا اوپر سے ہو کر ادھر آؤ..''

''کیوں؟''

''ادھر برف کی کھائی ہے سر..احتیاط کرو''

میرے آگے کوئی دراڑ نہ تھی..البتہ پہلو میں ایک نیلی ندی تھی جو بہت دیر سے میرے ساتھ بہتی ہوئی آرہی تھی..گلیشیئر کی برف میں راستہ بناتی چلی آرہی تھی..اس کے پانی نیلاہٹ سے چُور تھے اور جن برفوں میں سے وہ گزرتی تھی ان کا رنگ بھی شفاف نیلا تھا..

تب میں نے دیکھا کہ سب لوگ شدید فکرمندی کی حالت میں اور ذرے ذرے جہاں یہ ندی گم ہوتی تھی اور وہاں جو کھائی تھی اس میں جھانک رہے ہیں..مجھے یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے..

میں ابراہیم کی وارننگ کے مطابق ذرا پرے ہو کر احتیاط سے قدم رکھتا آگے ہوا.. آگے ایک برف گہرائی ایک کھائی تھی جس کے دوسرے کنارے پر سب مخلوق ذری ذری لیکن قدرے پُراشتیاق لگتی اس میں جھانک رہی تھی..

میں دوسرے کنارے تک پہنچا تو وہ سب ایک کنوئیں میں جھانک رہے تھے..

برف کے ایک آبشاری کنوئیں میں.. اور اس کا شور بے پناہ تھا.. وہ سب جھانکتے تھے ..ایک دوسرے کو تھامے ہوئے کہ کہیں وہ اس میں گر نہ جائیں.. جھجکتے لیکن پُرشوق ہوتے.. بدن میں دوڑتے خون کے ہر ذرے میں احتیاط برتتے.. وہ ایک ایسے برفانی بھنور کے طلسم کی زد میں تھے.. کہ آنکھیں نہ جھپکتے تھے..

میں ابھی صرف ان کے چہروں پر جو عجوبہ حیرت تھی اور ہر لمحے اس کی تصویر بدلتی تھی اُسے دیکھ رہا تھا.. ابھی جس میں وہ جھانکتے تھے اُسے نہ دیکھتا تھا.. میں اور قریب ہوا..

وہ ندی جو میرے برابر میں گلیشیر کی برفوں میں نیلاہٹ کی کرچیاں بکھیرتی بہتی آ رہی تھی یکدم یہاں پہنچ کر ایک برفانی کنوئیں میں گرتی جا رہی تھی.. ایک آبشار کی صورت.. اس کے سرد اور برف ہوتے پانیوں کا حجم پُرشور اور ہیبت بھری آوازوں کے ساتھ کنوئیں کی اتھاہ اور تاریک گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا..

کنوئیں کی برف دیواریں جہاں تک روشنی اترتی تھی شیشہ نیلاہٹ کے رنگ کی تھیں.. بلوریں فانوسوں کی مانند تھیں اور ان کے نیچے تاریکی تھی.. ندی کے پانی اس تاریکی میں گم ہو کر جانے کہاں جاتے تھے..

یہ ایک ایسا عجوبہ منظر تھا جو نہ تو آج تک کسی سائنس فکشن کی کتاب میں تخلیق ہوا ہے اور نہ اس نے کسی فینٹسی میں جنم لیا ہے.. یہ کسی داستان امیر حمزہ میں بھی بیان نہیں ہوا کہ.. اسے انسانی ذہن کی فینٹسی تخلیق ہی نہیں کر سکتی..

اوپر سے درہ ظفر سے اترتی برف کناروں میں مچلتی شیشہ ندی کے پانی یکدم ایک ایسی آبشار ہوتے تھے جو نیاگرا سے کہیں بڑھ کر شاندار اور دنگ کر دینے والی تھی اور یہ آبشار تقریباً بیس میٹر قطر کے ایک برفانی کنوئیں میں گر رہی تھی اور اس کنوئیں کی تہہ کہاں تھی وہ تو دکھائی نہیں دیتی تھی ..صرف اس آبشار کے گرنے کا شور تھا جو کہیں پاتال سے اٹھتا اوپر آتا تھا اور کانوں کو بہرا کرتا تھا..

کنواں بھی برف کا ہے.. پاتال بھی برف اور اس میں گرتے پانی نیلگوں شیشہ اور شور!

اس سے پیشتر میں نے بیافو گلیشیر پر ایک ایسا کنواں دیکھا تھا.. لیکن وہ بہت چھوٹا سا تھا اور اس میں پانی کی ایک چھوٹی سی نالی گرتی تھی.. یہ کیفیت نہ تھی..

میں جب آہستہ آہستہ اس کے گرد چلتا دوسری جانب گیا ہوں جہاں میرے ساتھی جھک جھک کر اسے دیکھتے تھے اور جب میں نے اس سفید خواب کنوئیں کی جھلک دیکھی تو بے اختیار اس میں جھانکنے کے لیے آگے بڑھا تو سلیم نے مجھے باقاعدہ جپھا مار کر پیچھے کر لیا کہ نہیں تارڑ صاحب.. خطرناک ہے.. اور یہ خطرناک تو تھا ایک پل میں آپ اس میں جھانکتے ہیں اور پھسل کر دوسرے پل میں اس آبشار کے ساتھ نیچے چلے جاتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں.. کوئی گر کر واپس آئے تو بتائے کہ کہاں جاتے ہیں..

البتہ ایک مہربانی تھی.. ایک آسانی تھی کہ اس کے کنارے ایسے ڈھلوان نہیں تھے کہ انسان لڑھک کر پھسلتے ہوئے اندر گر جائے بلکہ اونچے تھے..

میں آگے بڑھ کر اس میں نہ جھانکوں یہ تو نہیں ہونے کا.. جھانکنا تو مجھے بہر حال تھا.. بنا اس سفید مرگ میں جھانکے میں یہاں سے جانے کو نہ تھا.. میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ جو آبشار گر رہی ہے اور اس کے سرد شیشہ چھینٹے میرے چہرے پر کرچیوں کی مانند برستے اُسے یخ کرتے تھے تو کہاں تک گرتی ہے.. اس سفید بھید کی تہہ کہاں ہے.. میں نے ہر صورت یہ پتا لگانا تھا.. آ برف بیل مجھے مار.. کہنا تھا.. اور بہت غور کرنے سے مجھے ایک ترکیب سوجھی "ابراہیم"

ابراہیم میرے قریب آ گیا "جی صاحب.."

"دیکھو میں ادھر برف پر لیٹتا ہوں اور تم پیچھے سے میرے دونوں پاؤں پکڑ لو.. میں آہستہ آہستہ برف پر کھسکتا آگے ہوتا کنوئیں کے کنارے تک جاتا ہوں لیکن میرے پاؤں مضبوطی سے پکڑے رکھنا چھوڑنا نہیں.."

ابراہیم اگرچہ ایک اچھی روح تھی لیکن اس کنوئیں کی سرد موت اس کے سامنے تھی اور وہ روح اسے دیکھ کر پرواز کرنا چاہتی تھی "چھوڑیں صاحب.. خطرہ ہے"

"اگر تم میرے جوگرز کو پیچھے سے مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو اتنا خطرہ نہیں لیکن ابراہیم تمہیں آتشِ نمرود کی قسم میرے جوگرز نہ چھوڑنا.."

"کیا صاحب؟"

"کچھ نہیں.. بس میرے پاؤں نہیں چھوڑنے.."

میں نے اپنا مختصر رَک سیک اُتار کر برف پر پھینکا.. پہلے اپنے جوگرز کے تسمے کھول کر دوبارہ کسے کہ کہیں ڈھیلے ہونے کی صورت میں ایسا نہ ہو کہ وہ ابراہیم کے دونوں ہاتھوں میں رہ جائیں اور میں کنوئیں میں گر جاؤں.. پھر میں اپنے دونوں بازو پھیلا کر برف پر سیدھا لیٹ گیا جیسے بدھ حضرات مہاتما کے مجسمے کے سامنے لیٹ جاتے ہیں یا نئے کارڈینل حلف اٹھاتے وقت پوپ کے سامنے لیٹ جاتے ہیں.. ابراہیم نے پیچھے سے میرے دونوں پاؤں اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے اور میں رینگتا ہوا کنوئیں کے کنارے تک چلا گیا.. صرف کنارے تک نہیں ذرا آگے یہاں تک کہ میرا چہرہ اب اُس خلاء کے اوپر تھا جس کے نیچے کنوئیں کے جھنور میں آبشار دھما دھم گر رہی تھی.. میری جان.. جاگرز میں اٹکی ہوئی تھی جنہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا..

گھسٹتا ہوا جب میں آگے ہوا تھا تو میرا پورا بدن ان ہتھیلیوں تک جنہیں میں ایک تیراک کی مانند برف پر چلاتا آگے ہوا تھا ایک برفیلی اور منجمد کیفیت میں چلا گیا تھا لیکن جونہی میرا چہرہ اس گہرے غار کنوئیں کے اوپر آیا تو آبشار کے پانیوں کے نیچے جو تھاہ گہرائی تھی وہاں سے جو کٹیلی اور تند برفیلی ہوا ایک مرغولے کی طرح اٹھتی تھی یہ چہرہ اس کے راستے میں آیا تو گویا سردی سے حنوط ہو گیا..

چنانچہ میرا بدن تو برف تھا لیکن اُس میں زندگی کی رمق اور حرارت نہیں بجھی لیکن چہرہ جو تھاہ پاتال سے اُٹھتی.. مرغولوں کی صورت میں اُٹھتی برفیلی ہواؤں کی زد میں آ کر بقیہ بدن سے الگ ہو گیا اور حنوط ہو گیا..

میرا حنوط شدہ چہرہ کنوئیں میں جھانکتا تھا.. ایک بے پناہ شور اور نیلی برف گہرائی میری آنکھوں تلے تھی.. آنکھیں جنہیں سرد ہوا اور چھینٹے دیکھنے نہیں دیتے تھے..

اور میں کیا دیکھتا تھا..

برف کی سنگ مرمر سفیدی میں گھڑا ہوا کہیں کہیں نیلاہٹ میں رنگا ہوا ایک برف مرغولا جس میں سردیلی کرچیوں والے پانی گرتے چلے جاتے تھے.. گرتے چلے جاتے تھے.. اور وہ کہاں تک گرتے چلے جاتے تھے.. اس کا کوئی انت نہ تھا.. کچھ پتہ نہ چلتا تھا.. بس ایک کائناتی خلا تھا جس میں یہ پانی گونجتے گھومتے گرتے تھے.. نیچے کوئی بلیک ہول تھا جو پانی کی کائناتوں کو اپنے اندر کھینچتا.. چوستا انہیں ہمیشہ کے لیے معدوم کر رہا تھا..

میرا حنوط شدہ چہرہ آنکھیں نہیں جھپکتا تھا.. اور یہ آنکھیں جیسے وقت کی ایک برف غار

میں اترتی جا رہی ہیں.. آبشار کے ساتھ گرتی جا رہی ہیں اور اس غار کے آخر میں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی.. گھپ اور سرد اندھیرا ہے..

ابراہیم کبھی کبھار خوفزدہ ہو کر مجھے پیچھے گھسیٹ لیتا اور میں ہاتھ چلاتا پیراکی کرتا پھر سے آگے ہو جاتا کہ برف کے اس گمبھیر سانپ نے مجھے مسحور کر رکھا تھا..

وہ کچھ کہتا تھا.. شائد یہی کہ صاحب اب پیچھے ہو جاؤ لیکن پانیوں کے بے انت شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا اور اگر میں کچھ سن بھی لیتا تو جان بوجھ کر سنی ان سنی کر دیتا کہ کون ہے جو ایک برفانی تاج محل کے اندر چلا جائے اور پھر اپنی من مرضی سے واپس آ جائے..

کون ہے جو ایک نئی کائنات کے بھید کے اندر سفر کر رہا ہو اور اپنے قدم روک لے..

اس کنوئیں میں سے.. برف سنگ مرمر کے گول محل میں سے ایسی سرد ہواؤں کے مرغولے اٹھتے تھے جو آج تک کسی اور کے چہرے کو نہیں چھوئے تھے.. تو میں کیسے پیچھے ہو جاتا..

مجھے یہ مرغولے اپنی لپیٹ میں لے کر کہیں کا کہیں لے جا رہے تھے..

وقت کی غار میں سفر کرتا میں کہیں کا کہیں جا رہا تھا..

ان مرغولوں میں میرے بچپن کی تصویریں گھومتی چلی آتی تھیں..

ایک فوٹوگرافر کے سٹوڈیو میں ایک اونچے سٹول پر بیٹھا ہوا ایک گول مٹول بچہ.. گیلس کے ساتھ نیکر پہنے ہوئے.. پس منظر میں پردے پر ایک پہاڑی منظر ہے.. اور بچے کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہیں.. شائد وہ کیمرے سے خوفزدہ ہے.. کتنے برس پہلے.. صرف ستاون برس پہلے..

میرے دادا جان چوہدری امیر بخش ایک سادہ دہقان اتنے ہی برس پیشتر مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب ایک جوہڑ تک لے جا رہے ہیں کہ وہاں کچھ بطخیں ہیں جنہیں دیکھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں.. اور وہ سارا دن کھائے پیئے بغیر مجھے بطخوں سے کھیلتے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے اکلوتے پوتے کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں..

میرے اباجی کی نیلی آنکھیں اس کنوئیں کی نیلی دیواروں میں کہیں دکھائی دیتی ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتی ہیں.. سنو لیک پر پرواز کرنے والی تتلیاں جو کنوئیں کی تہہ میں سے اڑتی آتی تھیں میرے حنوط شدہ چہرے سے ٹکراتی تھیں اور وہ بھی برف کی ہیں اور کرچیوں میں بکھر جاتی ہیں.. پھر سے آبشار کے پانیوں میں شامل ہو کر نیچے چلی جاتی ہیں.. میرے چہرے کے نیچے ایک ایسا حیرت کدہ تھا کہ جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اگر میں اس لمحے اس کی خواہش کرتا تو وہ میرے

لیے پاتال سے اٹھتا مجھ پر کوئی صحیفہ نازل کر دیتا..

مجھے میرے رب نے کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا تھا جن کا میں شکر ادا نہیں کر سکتا تھا.. یہ نعمتیں آبشار کے پانیوں میں بھیگتی ہوئی آتی میرے یخ چہرے کو چھوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم جتنا بھی شکر ادا کرو کم ہے.. یا سلام یا مومن یا اللہ..

ابراہیم نے شاید مجھے مردہ جان لیا کہ میں حرکت نہ کرتا تھا.. اوندھا پڑا آبشار میں سے بلند ہوتے چھینٹوں میں بھیگتا بے سدھ اوندھا پڑا تھا.. اس نے زور لگا کر مجھے پیچھے کھینچ لیا لیکن میں اسی حالت میں دیر تک پڑا رہا.. برف پر برف ہوتا رہا..

عمران اسی نسخے پر عمل کر رہا تھا.. البتہ اس کا ایک پاؤں کاظمی کی گرفت میں تھا اور دوسرا جابر نے جکڑ رکھا تھا اور وہ تقریباً اپنا نصف بدن اس خلاء پر معلق کیے اس حیرت کدہ برف کو اپنے کیمرے میں اتار رہا تھا..

ہم اس طلسم سے بچھڑنا تو نہیں چاہتے تھے..

چاہتے تو یہ تھے کہ اس کے کنارے پر خیمہ زن ہو جائیں.. اور آج کی شب چاند میں جتنی بھی چاندنی ہے اس میں اپنے جوگرز ابراہیم کے ہاتھوں میں جکڑوا کر نیچے دیکھیں تو سہی جھانکیں تو سہی کہ اس سے اس آبشار منظر میں کیسے معجزے جنم لیتے ہیں.. کنوئیں کی برف دیواروں کی کرچیاں اس کی کرنوں میں کیسے کیسے دمکتی ہیں اور آبشار کے چھینٹے ایک انار میں سے چھوٹتے شراروں کی مانند کیسے الگ دکھائی دیتے ہیں.. شب کی تاریکی میں اپنے خیموں میں لیٹے ہوئے پانیوں کا یہ گرتا شور کیسے سنائی دیتا ہے..

لیکن جدائی پر اگر اختیار ہوتا تو یہ لفظ ہی وجود میں نہ آتا..

"سُرخ پتھر.. کروئی بخت.. اور گھاس پر بچھا ایک اور تخت"

ہمیں آج ہی سُرخ پتھر تک پہنچنا تھا..

ہر ایک نے اس برفانی کنوئیں کو ایک مندر کی طرح پرنام کیا.. اس میں گرتی آبشار کو دل ہی دل میں سجدہ کیا اور پھر اس سے جدائی اختیار کی..

اس کے سردیلے شور نے دور تک ہمارا پیچھا کیا اور جب خاموشی ہوئی تو بھی گلیشیر اختتام کو نہ پہنچا لیکن اب ہم.. اس سے جدا ہو کر ذرا اونچے ہوئے اور ایک ایسے بلند کنارے پر آ گئے جو ایک مسلسل پُل صراط تھا.. بال سے قدرے موٹا ہو گا لیکن اُسترے کی دھار ایسا تیز تھا.. دائیں جانب گلیشیر بدستور تھا..

یہ بلند کنارا دور سے ایسا لگتا تھا کہ اس پر کوئی پرندہ بھی بیٹھ نہیں سکتا یا اتنا تیز اور خطرناک تھا.. اور بہت اونچا تھا..

اس پر ایک مختصر سی پگڈنڈی تھی.. اور اس پر ہم ہاتھ پھیلائے.. واکنگ سٹکس سے اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے اب ایک شدید دھوپ کے گرم موسم میں چل رہے تھے..

یہ ایک عجیب اینٹی کلائمکس تھا..

ہم کوئے یار سے نکلے تھے تو سوئے دار چلے تھے..

اور سوئے دار جو بھی چلتا ہے.. ہم جیسا.. تو مجبوری اور ناتوانی میں چلتا ہے اور قدم گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے.. ایسے ہم چل رہے تھے..

یہاں دشواریاں اتنی بڑی تھیں لیکن آسان نہیں ہوتی تھیں..

وادی جو نیچے ہی نیچے جاری تھی اُس کے تقریباً درمیان میں یہ بلند فصیل تھی جس پر ہم

چل رہے تھے.. اور اپنے آپ کو دائیں جانب گرنے سے بچاتے تھے کہ وہ کمبخت گلیشیر ابھی تک نیچے چلا آ رہا تھا.. اور بائیں جانب گرنے سے گریز کرتے تھے کہ اُدھر پتھروں کے انبار تھے..

جب کسی کو یاد آیا کہ دوپہر ہو چکی ہے.. دن ڈھلنے کو آ رہا تھا اور ہم نے ابھی تک پیٹ پوجا نہیں کی تھی۔ ''ابراہیم..''

وہ کہیں آس پاس تھا حاضر ہو گیا ''جی صاحب؟''

''یار لنچ کدھر گیا.. کب کرے گا.. کہاں کرے گا؟''

''صاحب اس اونچے گلیشیر کے کنارے کا جہاں خاتمہ ہو رہا ہے.. وہاں نیچے.. بہت نیچے جدھر کچھ گھاس کچھ درخت دکھائی نہیں دے رہا؟''

''نہیں دکھائی دے رہا''

''ابھی دکھائی دے گا.. تو اُدھر رُکے گا اور لنچ کرے گا.. اِدھر تو رُکنے کا کوئی جگہ نہیں۔''

یہ ایک انتہائی پُر اذیت سفر تھا..

ہر کوئی نڈھال ہو چکا تھا.. ہم صبح سے چل رہے تھے اور بدن کی ناتوانی خوراک کی کمی کے باعث بھی.. اور تھکن کے بوجھ سے بھی.. بڑھتی جاتی تھی..

برف کنڈین کی آبشاری ٹھنڈک بدن سے رخصت ہو چکی تھی اور اب یہ جلتا تھا.. سلگتا تھا اور بھوکا تھا..

خدا خدا کر کے دائیں جانب جو واہیات اور ناپسندیدہ ملفوف گلیشیر اب تک چلا آتا تھا ختم ہوا.. ہم اس اُسترا دھار کنارے سے نیچے آئے.. نیچے آئے تو سخت نامعقول پتھروں کی دنیا میں آ گئے.. قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے.. گرتے پڑتے.. سفر کی صعوبت اس لمحے ایسی تھی کہ ہم ایک روٹی کے لیے.. مٹھی بھر چاولوں کے لیے اور ایک خیمے میں استراحت کی خاطر.. اپنا عقیدہ بدل سکتے تھے..

نہ ہم چل سکتے تھے.. نہ ہم رُک سکتے تھے..

اب اس جسمانی اور ذہنی اذیت کے بیان کو کیا طول دینا.. قصۂ درد مختصر کرتے ہیں تو شام کے پانچ بج رہے ہیں.. ہم لڑھکتے گرتے پڑتے.. ٹھوکریں کھاتے ایک گھاس بھری ڈھلوان تک بالآخر پہنچتے ہیں جہاں ہمارے پورٹر کب کے استراحت فرماتے ہیں اور ہمیں اس مقام پر پہنچ کر تھکن سے ڈھیر ہوتے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں..

''صاحب لنچ بنائے گا؟'' ابراہیم ہماری جانب آ گیا بلکہ ہمارے ڈھیر کی جانب آ گیا..

بنائے گا.. بنائے گا.. ہر جانب سے التجا کی صدائیں بلند ہوئیں جو کہہ رہی تھیں کہ ہم ٹوٹ چکے ہیں ہمیں خوراک سے جوڑ دو.. ہم بھوکے ہیں.. ہم بھوکے ہیں..

''ہم رات اُدھر کرے گا؟''

''نہیں صاحب ابھی صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر سُرخ پتھر کا علاقہ ہے آپ اُدھر پہنچے گا تو خوش ہو جائے گا.. رات اُدھر کرے گا۔''

''تو ابراہیم آپ ہمیں اُدھر ہی خوش کر لینا.. اِدھر لنچ بنائے گا تو رات ہو جائے گا.. چلو''

پورٹروں نے میرے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا.. کچھ ساتھیوں نے منہ بنائے اور بڑبڑائے اور ہم پھر سے چلنے لگے..

اگرچہ ابراہیم نے یہ بیان دیا تھا کہ سرخ پتھر کیمپنگ صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے لیکن اس نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا اس مسافت کے درمیان میں کم از کم تین چار ایسے پہاڑی نالوں کی تقریباً خشک گزرگاہیں واقع ہیں جن کے کنارے بے حد بلند ہیں اور ان میں اُترنا اور نیچے پہنچ کر دوسرے کنارے پر چڑھنا صرف اور صرف بکریوں.. اور پھر تِلی بکریوں کے بس میں ہے..

یہ ایسے نالے تھے کہ جب آپ جھاڑیوں اور درختوں میں سے گزر کر ان کے کناروں تک آتے تھے تو نیچے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ وہاں راستہ ہوتا ہی نہیں تھا.. ایک خیالی کنکریلی سیدھی دیوار ہوتی تھی.. جس کے دامن میں آپ کو اُترنا ہوتا تھا.. آپ یہاں پورٹروں کے ہاتھ تھام کر ایک خلا میں لڑھکتے ہوئے نیچے جاتے تھے.. نالے کے پانیوں کے پار جاتے تھے تو دوسرا کنارہ عرش سے باتیں کر رہا ہوتا تھا.. اور اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں کہ آپ اس سے درخواست کریں کہ محترم ہم پردیسی لوگ ہیں ہمیں ذرا خیریت سے گزر جانے دیں آپ کا بڑی مہربانی.. یہاں بھی پورٹر ہمیں ایک ڈولی کی صورت دونوں جانب سے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہمیں اٹھا کر اوپر لے جاتے تھے..

پار ہوتے ہیں تو ایک گھنا جنگل آتا ہے.. شاید وہ اتنا گھنا نہ ہو لیکن شام کے اترنے سے اور آنکھوں میں تھکاوٹ کا موتیا اُترنے سے وہ گھنا ہی دکھائی دیتا تھا.. وہاں آپ سانس درست کرتے ہیں.. کچھ دور چلتے ہیں تو ایک اور نالے کے بلند کنارے پر جا معلق ہوتے ہیں..

ایک اور نالے کے بلند کنارے پر ہم تادیر کھڑے رہتے ہیں کہ وہاں سے نیچے اُترنے

کا.. پورٹروں کی مدد کے باوجود کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا سوائے اس کے کہ اس میں چھلانگ لگا دی جائے۔

ہم اگر ایک قدم آگے کرتے تو لڑھکتے ہوئے.. متعدد پتھروں سے سر پھوڑنے کے بعد نالے کے پانیوں میں گر کر جاں بحق ہو جاتے.. تو ہم تا دیر کھڑے رہے کہ اب کیا کریں.. اور تب بکریوں کا ایک لاوارث ریوڑ کہیں سے آیا اور وہ نیچے اترنے لگا.. یہ ایک زندگی میں ایک بار آنے والا سنہری موقع تھا ہم سب نے اپنے اپنے حصے کی.. اور پسند کی ایک ایک بکری دبوچی اور اسے گلے لگا کر.. اسے ایک الفت بھرا جپھا مار کر.. اُس سے تقریباً لٹکتے ہوئے ایک بے خودی کے عالم میں اور اس عالم میں جس میں اپنی خبر بھی نہیں ہوتی.. ڈھول بجاتے گھسٹتے نیچے نالے تک پہنچ گئے.. اور یقین جانیے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ بکریاں اس والہانہ بغل گیری سے چونکی ہوں گی کہ اس سے پیشتر اس نوعیت کی بغل گیرین واردات اُن کے ساتھ شائد بکروں نے بھی نہیں کی تھی..

ان آفت نالوں کی گزرگاہوں کے پار.. اور ہمیں یہ علم نہ تھا یہ ایک نالہ آخری نالہ ہے کہ نہیں.. لیکن ایک آخری نالہ آیا جسے ہم نے عبور کیا..

اس کے پار کچھ درخت تھے.. اور درخت بھی برچ کے جن کے تنے اور شاخیں ڈھلتی شام میں ڈھانچوں کی سفید ہڈیوں کی مانند شام میں سفید ہوتی تھیں..

ہم جھاڑیوں اور سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے الجھتے برچ کے اس گھنے جنگل میں سے گزرتے آگے گئے تو وہاں کروئی بخت تھی..

برچ کے سفید جنگلوں میں سبز گھاس کا ایک جزیرہ تھا ایک وسیع میدان شام میں تھا.. ہم تنے بے بس اور تھکاوٹ کی کرچیوں کی خراشوں سے زخمی اور نڈھال تھے کہ پورٹروں نے آگے بڑھ کر ہمارے کندھوں سے رک سیک اتارے.. ہمارے ہانپتے لبوں میں پانی ڈالا.. نہ ڈالتے تو ہم فوت ہو جاتے.. اگر ہم فوت ہو جاتے تو ان کی مزدوری کون ادا کرتا.. پورٹر بڑے سیانے تھے..

"برچ کے سفید جنگل.. ایک روسٹ بکرا.. اور کوہ نوردی کی شبِ آخر"

"بکرا کس کا ہے؟"

"مالک کا ہے.."

"اور مالک کہاں ہے؟"

"نیچے گیا ہے.."

"نیچے کہاں گیا ہے؟"

"کیا معلوم کہاں گیا ہے.."

"کب آئے گا؟"

"کیا معلوم کب آئے گا.."

"تو پھر؟"

"دو ہزار.."

پورٹر بھی مجھ سے متفق تھے کہ بکرا دو ہزار کا ہرگز نہیں ہے اور شیخ بابا یہ جانتے ہوئے کہ یہ صاحب لوگ مجبور ہیں.. اس درّہ ولتر یا نیچے اشکومن سے بکرا خریدنے تو نہیں جائیں گے اس لیے وہ دو ہزار پر اڑے ہوئے تھے.. اور پندرہ سو کہنے پر بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے..

بالآخر میں نے پورٹر حضرات کی خدمت میں ایک تجویز پیش کی "بکرا دفع کریں.. میں آپ کو مزدوری کے علاوہ ایک ہزار روپے زائد دے دوں گا.. اسے آپس میں بانٹ لینا.. کیا یہ بہتر نہ ہوگا.."

"جی صاحب.. یہ بہتر ہے"

چنانچہ بکرا شیخ بابا کو جواب دے دیا گیا اور وہ اسی معصومیت اور بھولپن میں مسکراتا ہوا اپنے بکرے کو کھینچتا چراگاہ کے اوپر جنگل میں اپنے جھونپڑے کی طرف چلا گیا..

لیکن اس کے جانے سے ہم سب کی زندگیاں بے کیف ہو گئیں..

پورٹر اداس ہو گئے..

برچ کے جنگلوں کی سفید خوشنمائی مدھم ہو گئی..

ہوا سسکیاں سی بھرنے لگی.. صرف ایک بکرے کے چلے جانے سے..

ہمارے دلوں میں وسوسے تھے.. کیا پتہ ایک بکرا روم کے ترویی فوارے میں پھینکا جانے والا وہ سکہ ہو جس کی طفیل وہ شخص دوبارہ روم آتا ہے.. ایک بکرے کی قربانی سے.. دوبارہ بلند پہاڑوں میں آتا ہو.. آج کی شب اگر یہ بکرا ہو گئی تو کسے معلوم یہ پہاڑ پھر سے ہمارے نصیب میں نہ ہوں.. پہاڑی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایک بکرے کی قربانی ضروری ہو..

بس یہی وسوسے اور خدشات تھے جب میں نے اس نانہجار بکرے کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "لے آؤ.."

اس پر متعدد پورٹر قلانچیں بھرتے.. اپنی زبان میں نعرے لگاتے شیخ بابا کے جھونپڑے تک گئے اور بکرے کو ایک ہیرو کی صورت نہایت الفت سے کھینچتے میرے پاس لے آئے.. اور بکرے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے فاتح بابا جی بھی چلے آئے.. میں ادائیگی کرنے کو تھا کہ کاظمی جو برچ کے جنگلوں میں گم تھا وہاں گاتا پھرتا تھا آگے آیا.. بکرے کا بغور مطالعہ کیا اور کہنے لگا..

"تارڑ صاحب.. ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے.. یہ وہ بکرا تو نہیں جس کا ہمیں انتظار تھا.."

"تو پھر کونسا بکرا ہے؟"

"کوئی اور بکرا ہے.. اس بکرے کے دونوں کان کالے تھے اور اس کا ایک کان کالا ہے اور دوسرا سفید ہے اور یہ اس بکرے کی نسبت ذرا لاغر بھی ہے"

جب غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کاظمی درست کہتا تھا..

شیخ بابا نے پہلے تو ان الزامات کی بھرپور تردید کی اور جب پورٹروں نے بھی ہمارا ساتھ دیا تو کہنے لگے "میرے پاس اور بھی بکرے ہیں ہوسکتا ہے کچھ رد و بدل ہو گیا ہو"

اس پر کاظمی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ شیخ بابا کے بکرا باڑے میں ذاتی طور پر جائے اور طے شدہ بکرے کو تلاش کر کے لائے..

کاظمی نے نہایت احسن طریقے سے یہ فریضہ سرانجام دیا.. باڑے کے اندھیرے میں جہاں متعدد بکرا جات باں باں کرتے تھے بیٹری کی روشنی میں مطلوبہ بکرے کو ڈھونڈ نکالا اور اُسے نیچے چراگاہ میں لے آیا..

ہر طرف بہار آ گئی..

برچ کے جنگل دمکنے لگے..

ہوائیں گنگنانے لگیں..

پورٹروں کے چہروں پر رونق آ گئی.. اک تیرے آنے سے.. وہ کھوار گیت گاتے برچ کے جنگلوں میں گئے اور سوکھے تنے اور ٹہنیاں جمع کر کے لے آئے اور پھر سرخ پتھر خیمہ گاہ کے درمیان میں ایک الاؤ بھڑکنے لگا.. تاریخ میں کسی ایک بکرے نے اتنے لوگوں کو اتنی خوشی نہیں دی ہو گی..

بھوری داڑھی والا پورٹر جس نے بکرا مذاکرات کا آغاز کیا تھا پھر سے ایک مقدس سی شکل بنائے میرے پاس آیا' صاحب آپ آؤ اور بکرے پر چھری چلاؤ"

"چھری؟" میں نروس ہو گیا کیونکہ میں ایک نہایت تھڑدلا اور بزدل شخص ہوں.. میں نے آج تک اپنے ہاتھوں سے ایک مرغی بھی حلال نہیں کی بلکہ مرغی حلال کی جا رہی ہو تو میں منہ پرے کر لیتا ہوں اور میں آسانی سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی مرغی یا کسی بھی جانور کو آنکھیں چھپائے بغیر مکمل یکسوئی کے ساتھ حلال ہوتے نہیں دیکھا.. اُدھر چھری چلی اور ادھر میری نظریں آسمان پر..

"میرے پاس چھری نہیں ہے"

"میرے پاس ہے" بھوری داڑھی والے نے اپنی شلوار کے نیفے میں سے ایک خنجر نما شے برآمد کر کے میرے سامنے لہرائی..

"بھئی آپ خود ہی چلا لو.."

"یہ کیسے ہوسکتا ہے صاحب.. آپ ٹیم کا لیڈر ہو.. آپ نے مہربانی کی ہے تو چھری آپ چلائے گا.."

"شاہد صاحب.. آپ نے ذاتی طور پر اپنے آپ کو ڈپٹی لیڈری کے عہدے پر فائز کر رکھا ہے تو چھری آپ چلائیں۔"

"نہیں سر.. لیڈر کے ہوتے ہوئے میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں.." یہ کہہ کر وہ فوری طور پر وہاں سے کھسک گئے..

"تارڑ صاحب.." عمران کیمرے والی داڑھی کھجاتا نیم تاریکی میں سے نمودار ہو گیا "یہ تو زبردست شاٹ بنے گا سر.. الاؤ کی روشنی میں ایک قدیم رواج کے مطابق کہیں بلند پہاڑوں میں آپ ایک بکرے کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے.. انکار نہ کریں"

میں نے پھر بھی انکار کر دیا.. پورٹر اصرار کرتے رہے کہ وہ واقعی میری توقیر کرنا چاہتے تھے.. بالآخر اس بات پر تصفیہ ہو گیا کہ میں چھری تھام کر اس پر بسم اللہ پڑھوں گا اور پھر اسے بھوری داڑھی والے پورٹر کو دے دوں گا.. اور وہ بکرا حلال کر دے گا میری جانب سے..

تصفیہ ہو گیا..

الاؤ کی تیز بھڑک بدن کو جلاتی تھی..

پکھورا گلیشیئر کی وادی میں سے اترتی برفیلی ہوا اس چراگاہ کی رات میں پھنکارتی.. بلند صدائیں دیتی آتی تھی اور ہمیں سرد کرتی تھی اور اس کے باوجود الاؤ کے سامنے جو بدن تھا وہ اس کی آتش میں جلتا تھا.. اگرچہ کمر اور پیٹھ پر وہ سرد ہوا اسے منجمد کرتی تھی..

بکرے کا خون پل بھر میں ٹھنڈا ہو گیا تھا.. میں نے اسے جان کنی کی حالت میں تڑپتے اور حلق میں سے خرخراتی آخری آوازیں نکالتے نہیں دیکھا تھا.. تب دیکھا تھا جب ایک پورٹر اس کی بے جان آنکھوں والا سر کان سے پکڑ کر الاؤ میں بھوننے لگ گیا تھا.. وہ پل بھر میں سیاہ ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں آگ میں بھی مجھے دیکھتی ہوئی لگتی تھیں..

گدا اور گرد آمیز کا خیمہ ہم سے الگ اور آج بہت ہی طویل فاصلے پر ایک بلند کنارے کے قریب روٹھا ہوا لگتا تھا اور ان دونوں نے آج کی شب ہم سے میل جول مناسب خیال نہ کیا تھا اور شاید سو چکے تھے..

الاؤ میں بھونا گیا بکرے کا گوشت سب سے پہلے مجھے پیش کیا گیا.. وہ میرے ناتواں دانتوں کے لیے قدرے سخت تھا اور جلا ہوا تھا.. اس میں کوئلے کا ذائقہ تھا.. میں نے پورٹروں کا دل رکھنے کے لیے دو چار بوٹیاں بمشکل نگلیں.. لیکن وہ اسے نہایت رغبت سے کھا رہے تھے اور کھوار گیت گاتے تھے..

بھوری داڑھی والا پورٹر ترنگ میں تھا اور الاؤ کے گرد ناچتا تھا..

"عشق کیا ہے سر.."

"لعنت ہو تم پر.." میرے منہ میں جلے ہوئے گوشت کی کڑواہٹ تھی "کیوں مجھے تنگ کرتے ہو.. کیا اس کوہ نوردی میں تم صرف اس لیے میرے ساتھ آئے ہو کہ یہ واہیات سوال پوچھ پوچھ کر مجھے زچ کر دو.."

"سوری سر.." سلیم کے چہرے پر افسوس کی عبارت تھی..

ہوا تیز ہوتی تو برچ کے جنگلوں میں جیسے کوئی چلنے لگتا.. الاؤ کے شرارے اڑ کر ہمارے چہروں تک آتے اور ہم آنکھیں بند کر لیتے..

"سنو شہزادے.." میں نے راکھ کریدتے ہوئے کہا کہ اب میں کہنا چاہتا تھا "اس راکھ میں بکرے کے خون کے لوتھڑے بے جان اور سرد ہیں.. یہی عشق ہے.. رائیگانی کا.. یہ جو برچ کے تنے اور شاخیں الاؤ میں دھڑ دھڑ جلتی ہیں اور ہمارے چہروں کو جلاتی ہیں.. اور وہ جو گلیشئر سے جو برفیلی ہوائیں اس چراگاہ میں سنسناتی ہوئی آتی ہیں اور بقیہ بدن کو یخ کرتی ہیں تو یہی کیفیت ہے عشق کی.. نہ جلا کر راکھ کرتا ہے اور نہ منجمد کر کے محفوظ کر دیتا ہے.. اور عشق.. حسد ہے.. جتنا بڑا حسد ہوتا ہے اتنا بڑا ہی عشق ہوتا ہے.. تم اس پیراہن سے حسد کرتے ہو جو اس کے بدن پر ہوتا ہے.. ہر اس ٹیلی فون کال سے جلتے ہو جو تمہارے لیے نہیں ہوتی.. اس بارش سے نفرت کرتے ہو جو اس کے چہرے پر پڑتی ہے اور پھر اپنے آپ سے بھی کرتے ہو کہ میں اس کی اتنی قربت میں کیوں ہوں.."

"تھینک یو سر.." سلیم ہنسنے لگا "بہت ہو گئی.. یہ کافی ہے"

"نہیں تم نہ سنو تو اب میں اپنے آپ سے کہنا چاہتا ہوں.. ذرا اس رات میں.. اس الاؤ کے قریب بیٹھے.. ایک ایسے اجنبی مقام میں جہاں تم پہلی بار آئے ہو اور جہاں دوبارہ تم کبھی نہیں آؤ گے.. الاؤ کی راکھ اور چنگاریوں کو اپنے چہرے پر اترتے محسوس کرتے تم ذرا اوپر برچ کے ان جنگلوں کو غور سے دیکھو جن کے سفید تنے اور ٹہنیاں تاریکی میں بھی جھائی دے رہے ہیں.. تو کیا اس لمحے ان میں سے تمہاری زندگی بھر کے عشق.. حیاتی کی دیوانگیاں اور وحشتیں جھانکتی ظاہر ہوتی نظر نہیں آتیں؟" کتنی شادگوریاں ہیں جو دکھائی دے رہی ہیں.. اور کتنی تھمیں ہیں جو تمہارے الاؤ سے تپش شدہ جلتے بدن پر اپنے پتوں کی ٹھنڈک بکھیر کر تم پر راج کرتی ہیں.. ان جنگلوں میں سے الاؤ حق کی صدائیں آتی ہیں لیکن تم سن نہیں رہے.. شاہ حسین کہہ رہا ہے کہ میں ناہیں سب توں.. اور

تم سن نہیں رہے.. اور ذرا سنو کہ وارث شاہ کہہ رہا ہے کہ عشق بولدا نڈھی دے تھاؤں تھائیں.. یعنی عشق لڑکی کے.. ہیر کے بدن کے ہر حصے میں سے بولتا ہے.. تو یہ عشق تو تھاؤں تھائیں.. ہر جگہ ہر مقام پر.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. کہیں قلعہ دراوڑ کے زیر زمین ایک آئینہ ور آئینہ کمرے میں اور کہیں شاہ گوری کے بدن میں بولتا ہے اور تم سن نہیں سکتے۔"

یکدم جیسے ہر شے سکوت میں چلی گئی ہو.. چپ ہو گئی ہو.. پھورا نالے کی آواز بھی گم.. برچ کے جنگل سناٹے میں.. یہاں تک کہ الاؤ کی بھڑک نے بھی اپنے ہونٹ بھینچے تھے.. شاید اس لیے کہ ہم سن سکیں..

"کچھ نہیں سر۔"

"تم کچھ سن رہے ہو؟"

"آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سن رہا ہوں"

"تم حافظ برخوردار کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"اپنی زبان سے غفلت اور اجتناب ہمیں کیسا بدنصیب کر دیتا ہے کہ ہم اپنی آبائی دانش سے محروم ہو جاتے ہیں.. اس نے "مرزا صاحباں" لکھی تھی اور وہ عشق کے بارے میں کہتا ہے کہ حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا پوش.. یعنی عشق ایک ایسا مست ہاتھی ہے کہ پوش پوش.. یعنی ہٹ جاؤ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ کی وارننگ دی جاتی ہے کہ یہ تمہیں روند ڈالے گا.. رکے گا نہیں.. تو یہ بھی عشق ہے شہزادے۔"

"یہ ہماری آخری رات ہے پہاڑوں میں۔" میں جان گیا کہ سلیم میری اس لایعنی خود کلامی سے بیزار ہو چکا ہے اور موضوع بدلنا چاہتا ہے..

"ہاں.. کل رات تو پھورا کے قصبے میں آئے گی.. پہاڑوں میں نہیں۔"

"تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

"تسلی نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس لطف نہیں آیا.. جان کے لالے نہیں پڑے.. لطف بھی موت کی سرد موجودگی میں آتا ہے کہ اسے آپ جل دے جاتے ہیں.. اس سے بچ نکلتے ہیں تو اس بار تسلی نہیں ہوئی۔"

"تو کیا آپ مرگ کی خواہش لے کر گھر سے نکلتے ہیں؟"

"قطعی نہیں.. ڈرتے ڈرتے گھر سے نکلتے ہیں.. دعائیں کرتے کہ یا اللہ اپنے بچوں کے چہرے پھر سے دکھانا.. خیریت سے واپس لانا.. لیکن اس کے باوجود کہیں ایک تمنا دل میں پناہ گزیں ہوتی ہے کہ موت نے آنا تو ہے تو یہیں آ جائے.. ایک ساٹھ لاکھ آبادی کے ٹریفک کے دھوئیں بھرے پرشور شہر کے ایک کمرے میں نہ آئے۔"

"تو سر.. موت کیا ہے؟"

"موت ہی.. عشق ہے۔"

الاؤ کب کا بجھ چکا تھا..

پورٹر جنگل کے دامن میں اپنے بوسیدہ کمبل اوڑھے جلے بجھے بکرے کے گوشت کے خمار میں گم ہو چکے تھے..

صرف ہم تھے جو راکھ کریدتے تھے..

اور ہم سے اوپر برچ کا جنگل سکوت ترک کر کے ایک بار پھر زندہ ہوتا تھا.. برچ کی ٹہنیاں تھیں اور شاخیں تھیں جو سفید ہڈیوں کی مانند روشن ہوتی تھیں جیسے ان میں جان پڑتی تھی اور ان میں سے شاہ گوریاں اترتی تھیں.. سنولیک کی منجمد تتلیاں زندہ ہو کر پھڑ پھڑاتی آتی تھیں اور کوہ نوردی کی اس آخری رات میں جب کہ الاؤ بجھ چکا تھا اور ہم دونوں تاریکی میں تھے.. یہ شاہ گوریاں یہ تتلیاں ہمارے چہروں کو چومتی تھیں اور کہتی تھیں.. بس یہی عشق ہے۔

"برچ کے سفید جنگلوں میں ایک سویر.. جو دھند میں غرق تھی.."

بہت دیر کے بعد کھلا کہ میں خواب میں تھا.. نیند میں نہیں.. جاگ چکا ہوں.. میں ایلس ہوں اور ایک ونڈر لینڈ میں ہوں..

ہر شے دھند میں ڈوبی ہوئی ہے.. پورا جنگل ڈوبا ہوا ہے.. جیسے ایک پورا شہر پانی میں ڈوب جائے.. دھند میں غرق ہے اور جیسے کہیں پانی کم ہوں تو اس شہر کا کوئی برج کوئی مینار کوئی چوکھٹ نظر آ جاتی ہے ایسے کہیں دھند ہلکی ہوتی تھی تو اس میں سے کوئی ٹیڑھا میڑھا برچ کا درخت ایک اپاہج گداگر کی مانند ظاہر ہونے لگتا تھا.. کوئی ایک ایسی ٹہنی دکھائی دینے لگتی تھی جس کی سفیدی دھند سے الگ ہو کر تازہ اور گیلے پینٹ کی مانند چمکتی تھی.. کہیں ایک سوکھا شجر ایک آسیب کی طرح ظاہر ہونے لگا ہے.. اور کبھی برچ کے جنگلوں میں بہتی کسی نیم پوشیدہ ندی کے پانی پاؤں بھگو دیتے تھے..

میں ہر قدم احتیاط سے رکھتا تھا.. آنکھیں بند کر کے رکھتا تھا کہ کہیں دھند میں ملفوف سوکھی ٹہنی ان میں چبھ نہ جائے.. البتہ چلتے ہوئے یہ شاخیں اور ٹہنیاں میرے بدن کو مسلسل کریدتی تھیں..

برچ کے جنگل میں اس سے میں تنہا چلتا تھا.. چلتا تھا اور گم ہوتا تھا.. اس کے پیڑ پتے جھاڑیاں اور زمین پر بچھی گھنی گھاس سب کے سب ان چھوئے تھے اور مجھے چھونے کی کوشش کر رہے تھے.. کہ میں پہلا شخص تھا جو ان میں آ نکلا تھا.. یوں لگتا تھا جیسے وہ آج تک کسی بھی ذی روح سے ناآشنا تھے اور ان میں تجسس تھا کہ یہ کون جانور ہے جو اس وقت.. جب رات ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوئی.. سویر ابھی طرح گلیشیئر پر نہیں اتری.. برفانی کنویں میں ابھی گھپ اندھیرا ہے تو یہ کون ہے جو ادھر آ نکلا ہے..

رات بھر میں نیند میں مدہوش رہا..

مدہوش او غافل لیکن سحر خیزی کی عادت نے جو الارم میرے اندر نصب کر رکھا تھا اس نے مجھے بیدار کر دیا.. میں اپنے تئیں لاہور میں تھا اور مجھے اب اپنا بستر ترک کر کے.. چہرے پر چند چھینٹے ڈال کر.. جوگنگ سوٹ بدن پر کھینچ کر.. ماڈل ٹاؤن پارک میں صبح کی سیر کو جانا تھا.. کچے ٹریک پر چلتے ہوئے.. دوسری جانب سے نیم تاریکی میں نمودار ہونے والے شیخ صاحب.. سردار صاحب.. بیگ صاحب.. قاضی صاحب اور شاہ صاحب کو بلند آواز میں السلام علیکم کہتے ہوئے دو چکر پورے کرنے تھے.. لیکن پھر کھلا کہ نہیں میں لاہور میں نہیں استاد محمد علی کے گل بوٹوں سے تراشے ہوئے فیل پایہ دیار کے پلنگ پر نہیں بلکہ کہیں اور ہوں.. میرے نیچے زمین سخت ہے اور بے حد سردی ہے اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں پیک شدہ جاگ رہا ہوں لیکن کہاں ہوں؟

ایک نامعلوم چراگاہ میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں..

میں اگرچہ پھر سے آنکھیں موند کر نیند میں غرق ہو جانا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا..

صرف اس لیے کہ میری درمیانی منزل میں پانیوں کا بوجھ تھا جو مجھے بے چین کرتا تھا..

مجھے ان سے نجات حاصل کرنے کی خاطر مجبوراً اٹھنا پڑا.. جوگرز چڑھائے اور پھر خیمے سے باہر آ گیا..

میرے تالو میں سے ابھی تک جلے ہوئے گوشت کا ذائقہ پھوٹتا تھا..

باہر تقریباً رات تھی..

الاؤ کی سرد راکھ اور جلی بجھی برچ کی لکڑیوں کے گرد چند پورٹر مدہوش پڑے تھے..

بکرے کی کھال ایک خشک تنے سے لٹکی تھی اور شائد مجھ سے فریاد کرتی تھی کہ اے سنگدل شخص تم نے مجھے ہی کیوں چنا تھا.. میرے کسی اور سنگی ساتھی کو پسند کر لیتا تو میں اس وقت اپنے باڑے میں زندہ ہوتا اور بآ بآ کر رہا ہوتا..

میں اس لٹکی کھال میں کبھی جو بدن تھا اس کا ذائقہ محسوس کرتا شرمندہ ہوا اور اس سے نظریں چرا کر بائیں جانب ایک ڈھلوان پر چڑھتا جنگل کے اندر چلا گیا..

دراصل مجھے قطعی احساس نہ ہوا کہ میں جنگل کے اندر جا رہا ہوں کیونکہ دھند ہر سو ٹھہری ہوئی تھی اور میں اس میں بھٹکتا اپنے خیمے سے ذرا دور ہو کر اپنے آپ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا.. اور جب میں فراغت حاصل کر چکا تو ظاہر ہوا کہ میں دراصل برچ کے درختوں کے ذخیرے میں اتر چکا